اردو کا معتوب شاعر

مرزا واجد حسین یاسؔ یگانہ چنگیزی

مصنف : نورالحسن

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد

اردو کا معتوب شاعر

مرزا واجد حسین یاسؔ یگانہ چنگیزی

مصنف : نورالحسن

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ، حیدرآباد

اُردو کا معتوب شاعر

یاسؔ عظیم آبادی۔ یگانہؔ چنگیزی

(مصنفہ)

نور الحسن بی۔ اے، بی۔ ٹی (علیگ) ڈپ، ایڈ (گلاسگو)

ستمبر ۱۹۶۴ء

قیمت۔ ایک روپیہ

مصنّف کی دوسری مطبوعات

بچہ سن بلوغ تک	قیمت دو روپیہ
سماجی علم (انعام یافتہ کتاب)	" دو روپیہ آٹھ آنے
ذ سکا۔ ترجمہ	ایک روپیہ بارہ آنے
جیون کہانیاں	ایک روپیہ

ملنے کا پتہ

136/6-3 آبگینہ حمایت نگر حیدرآباد (اے پی)

جلد چہارم

طبع
بار اول ایک ہزار — تعداد 1000

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

صفحہ

پیش لفظ

اپنی کتاب پر کسی دوسرے سے مقدمہ لکھوانا تعریف کے لئے بھیک مانگنے کے برابر ہے۔ مقدمہ نویس شرماشرمی دو چار لفظ تعریف و توصیف کے لکھ ہی دیتا ہے اور مصنف یا مؤلف اُن کو لے اڑتا ہے اور خوب خوب ڈھنڈورا پیٹتا ہے۔ اس خیال کے تحت میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اپنی اس حقیر کوشش کو آپ حضرات کے سامنے بغیر حاشیوں کے پیش کر دوں اور آپ ہی کو فیصلہ کرنے دوں کہ ایک روپیہ میں مال سستا ہے یا مہنگا، اچھا ہے یا بُرا۔

یہ مضمون "اردو ہال" حیدرآباد میں "اردو مجلس" کے تجربہ کار، علم دوست اور اردو نواز صدر رائے جانکی پرشاد صاحب کی دعوت اور اس مجلس کے کارگزار جوشیلے معتمد منظور احمد صاحب کے اصرار پر پڑھا گیا تھا۔ حاضرین نے مضمون کو بہت پسند کیا اور یگانہ کے کلام سے بیحد محظوظ ہوئے۔ عزیزوں اور دوستوں نے دل بڑھایا اور مضمون کو کتابی صورت میں شائع کرنے کیلئے تیار کیا۔ اس کساد بازاری اور بے روزگاری کے زمانے میں کسی کتاب کا شائع کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ مجھ جیسا متوسط آدمی تو مشکل ہی سے اس بار کا متحمل ہو سکتا تھا اور پھر جب اُسکا ذاتی تجربہ بھی ہو کہ اردو کی کتابوں کی مانگ بہت کم ہے۔ خرید کر پڑھنا ہماری سرشت میں داخل نہیں ہے لیکن اس پر بھی میں نے ہمت کر کے یاس عظیم آبادی یگانہ چنگیزی کا کلام آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے تاکہ آپ ان کی ندرت، اپج، انوکھے اسلوب بیان، بلند تصورات اور تخیلات سے لطف اندوز ہو سکیں اور شاعر کو خراج تحسین ادا کر سکیں جسکا وہ صحیح معنی میں مستحق ہے۔

احقر نور الحسن

۱

اُردو کا معتوب شاعر

یاسؔ عظیم آبادی ۔ یگانہ چنگیزی

؎ فرید وقت ہیں یہ میرزا یگانہ بھی

اُردو ادب کی یہ نہایت بدبختی ہے کہ اُس کے ناقدوں میں کافی وسعتِ نظر پیدا نہیں ہوئی ہے ۔ وہ بڑی حد تک تنگ نظر اور جانبدار ہیں ۔ اپنی خود کی کوئی رائے نہیں رکھتے بلکہ قدیم زمانہ سے جن کی تعریفیں سنتے آئے ہیں اُنہی کی صفتوں کو دُہراتے ہیں ہاں البتہ طرزِ ادا اور انداز بیاں نیا ہے ۔ پُرانی شراب نئے پیمانوں میں پیش کی جارہی ہے ۔ مغرب کی نقالی کرکے تنقید کے چند اصول بھی مرتب کر لئے گئے ہیں ۔ وہ زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھتے ہیں ۔ حق اور صاف بات کہتے ہوئے گھبراتے اور ہچکچاتے ہیں ۔ وہ ماہر اور شاطر غواص کی طرح بحرِ ادب میں غوطہ زن ہو کر سچے موتی نکال کر لانے کی کوشش نہیں کرتے ، تاکہ پرکھنے والے پرکھیں کہ اُن میں سے

کس کی آب و تاب واقعی آنکھوں کو خیرہ کرنے والی ہے۔

بقول احتشام حسین "اردو ادب کے بہت سے ناقدین کی خامی یہ ہے کہ وہ جس شاعر یا ادیب پر تنقید کرتے ہیں اُس کے متعلق صرف چند سوانحی معلومات اور اُس کے معاصرین میں اُس کی حیثیت سے بحث کرنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں، حالانکہ اُن کو اُس سماج کے مسائل، سیاسی اور اقتصادی حالات، نیز معاشرتی اور ثقافتی کیفیات اور خصوصیت کے ساتھ اُس شاعر یا ادیب کی ذہنی ارتقا کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔" حُسن کی دریافت کا کام ناقد کا ہے۔ فن کار تخلیق کرتا ہے اور ناقد اس کی تزئین اور تکمیل کرتا ہے۔ دونوں کا کام تخلیقی ہے"

ہمارے ناقدین نے ایک اور گمراہ کن طریقہ اختیار کیا ہے جو نہایت افسوسناک ہے۔ یعنی وہ اپنی پسند کے شاعروں کو بامِ منزلت پر پہنچانے کی امکانی حد تک کوشش کرتے ہیں اور جن کو وہ کسی نہ کسی وجہ سے پسند نہیں کرتے اُن کو گرانا چاہتے ہیں۔ جہاں تک اُن کا بس چلتا ہے ایسے شاعروں کا ذکر تک نہیں کرتے جو اُن کے ہم مشرب اور ہم خیال نہیں ہیں۔ یہ گُر انہوں نے آج کل کے سیاست دانوں سے سیکھا ہے کیونکہ

مسندِ سیاست اور حکومت پر متمکن حضرات جن کو عزت، وقار اور اقتدار عطا کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا ذکرِ خیر بار بار کیا جاتا ہے۔ روزنامہ اخباروں میں نام آتا ہے تصویریں چھپتی ہیں۔ اُن کے کارناموں سے کالم کے کالم رنگے ہوتے ہیں۔ اور جن پہ خاک ڈالنی چاہتے ہیں اُن کا نام تک نہیں لیتے۔ راہِ وفا میں جنہوں نے سب کچھ لُٹا دیا۔ یہاں تک کہ جان کی بازی لگا دینے والے، قید و بند کی اذیتیں سہنے والے وطن کے شیدائی اور سورما آج گم نامی کے لاکھوں من خاک کے نیچے دبا دیئے گئے ہیں۔

اردو ادب کی واقعی یہ بدقسمتی ہے کہ انیس جیسا عظیم المرتبت شاعر جس کا جواب اردو تو کیا دنیا کی کوئی اور زبان مشکل ہی پیش کر سکتی ہے آج تقریباً گمنامی کا شکار ہے۔ یہ مایۂ ناز شاعر جس نے فصاحت کے دریا بہا دیئے۔ یہ شہنشاہِ اقلیمِ سخن جس کو زبان پر بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ یہ باغبانِ بوستانِ سخن جس نے اردو شاعری کے گلشن میں رنگ برنگ کے پھول کھلائے اور طرح طرح کی کیاریوں اور روشوں سے اس چمن کو آراستہ کیا جس

نے اردو شاعری کو وہ سب کچھ دیا جو دوسری زبانوں کو صدیوں میں کئی چوٹی کے شاعر مل کر نہ دے سکے ۔ بقول خود انیس مرحوم

مری قدر کر اے زمینِ سخن		تجھے بات میں آسماں کر دیا
سبک ہو چلی تھی ترازوِ شعر		مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

لیکن انصاف شرط ہے کہ کیا ہم نے اس جلیل القدر شاعر کو اپنی محفلوں اور کالجوں میں وہ جگہ دی جو اس عظیم المرتبت شاعر کے شایانِ شان ہے ۔

اِس کے اسباب پر انشاءاللہ میں پھر کبھی روشنی ڈالوں گا ۔ اِس وقت مجھے ایک دوسری منفرد شخصیت کے حامل شاعر کی انفرادیت کو اُجاگر کرنا مقصود ہے جس کے ساتھ صرف اس لئے زیادتی کی گئی کہ اُس نے غالب پر کیچڑ اُچھالا تھا ۔ اُس نے یہ اچھّا کیا تھا یا بُرا ۔ یہ بحث جداگانہ ہے ۔ لیکن اُس کے ہُنر کی قرار واقعی قدر نہ کر کے ہم اپنے ادب کے ساتھ انصاف برت رہے ہیں یا نا انصافی ۔

کسی کی اچھائیوں کو نظر انداز کر دینا اور صرف بُرائیوں اور کمزوریوں کا ڈھنڈورا پیٹنا یہ ادبی خدمت ہے یا بد خدمتی ۔ آپ

سمجھ گئے ہونگے کہ میرا روئے سخن "خاکِ عظیم آباد اور ابروئے لکھنو" کی طرف ہے۔ یہ علم بردارِ بغاوت جس کو یاس عظیم آبادی۔ یگانہ چنگیزی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے واقعی یگانہ روزگار ہے۔

میں نے یگانہ کو پہلے پہل اٹاوہ میں دیکھا تھا۔ اُن دنوں ڈاکٹر ضیاء الدین کے شاگرد رشید قاضی خورشید احمد مرحوم جو اپنی ریاضی دانی کے لئے ہندوستان بھر میں مشہور تھے اٹاوہ گورنمنٹ انٹر کالج کے پرنسپل تھے اور مولوی الطاف حسین مرحوم جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بھی اُستاد محترم تھے اسلامیہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ خان بہادر عین الدین صاحب مرحوم جو بعد میں نواب صاحب چھتاری کی صدر اعظمی کے زمانہ میں ریونو افسر ہو کر حیدرآباد بھی آئے تھے اٹاوہ کے ڈپٹی کلکٹر تھے اور اُن کے برادر بزرگ زین الدین صاحب مین پوری کے کلکٹر۔ فانی کے مداحوں نے فانی کو وکالت کرنے کے لئے اٹاوہ ہی میں بلا لیا تھا۔ یاس بھی اٹاوہ میں گھسیٹ بلائے گئے تھے۔ یہ ۱۹۲۳ء کے واقعات ہیں۔ اُن دنوں میں انٹر گورنمنٹ کالج اٹاوہ کا طالب علم تھا۔

قاضی جی کی وجہ سے اٹاوہ کے علمی حلقوں میں خوب چہل پہل اور دھوم دھام تھی۔ ٹھاٹ دار آل انڈیا مشاعرے ہوتے تھے۔ ہم نوجوان طالب علموں کی دھما چوکڑی اور چہلیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ یو۔پی کے مشہور شاعر کھنچ کھنچ کر ان مشاعروں میں آتے تھے اور دادِ سخن حاصل کرتے تھے۔ جوش ملیح آبادی، اثر لکھنوی، احسن مارہروی، جگر مرادآبادی اور سیماب مع اپنے اُبھرتے ہوئے شاگرد ساغر کے رونق افروز ہوتے تھے۔

بہرحال اس رنگارنگ فضا میں یاس کا کلام رُک جانے اور سوچنے کی دعوت دیتا تھا۔ اُن کے کلام کی سج دھج ہی انوکھی اور نرالی تھی۔ وہ اپنے ماحول کو پہچانتے تھے بلکہ اُس سے بے حد متاثر تھے۔ اُن کے لہجے اور اندازِ ادا میں ایک تیکھا پن اور بانکپن ہے۔ وہ جذبات میں بہتے نہیں بلکہ جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ جب کسی شئے کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں تو کہیں تذبذب، شک و شبہ نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو اپنی رائے اور فیصلوں پر پورا بھروسہ ہے۔ غالباً ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء تک اٹاوہ سے

سے یاسؔ 'صحیفہ' نکالتے تھے ۔ مالی مشکلات کے باعث صحیفہ
بند ہو گیا۔ اٹاوہ کے بعد یاسؔ نے کچھ دن کے لئے علی گڑھ میں بھی
قیام کیا اور وہاں سے وہ حیدرآباد آئے اور عابد منزل میں میرے
برادرِ بزرگ علمبردار صاحب اور غلام پنجتن صاحب کے مہمان ہوئے
بھائی صاحب قبلہ کے توسط سے مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنۃ
سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ۔ مہاراجہ مرحوم علم و ادب کے دلدادہ
تھے' اُن کے دربار میں شعر و شاعری کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔
دور و نزدیک کے اہلِ ہنر اُن کی داد و دہش سے مستفیض ہوتے
تھے ۔ ان مشاعروں میں فانیؔ' محوی اور جوشؔ بھی شریک ہوتے تھے۔
یاسؔ کو مہاراجہ بہادر کے یہاں کی دربار داری پسند نہیں آئی فرمائشی
طرحوں پر غزلیں کہنا اُن کے مزاج کے خلاف تھا ۔ اس لئے مہاراجہ
سے جو مالی فائدہ فانیؔ یا دوسرے شاعروں کو پہنچا اُس سے خود
کو یاسؔ نے محروم کر لیا ۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ مہاراجہ کی اشرفیاں ان
کی قسمت میں نہیں تھیں ۔

اس صورتِ حال کو دیکھ کر بشیر یار جنگ نے جو اُس زمانہ

میں انسپکٹر جنرل رجسٹریشن و اسٹامپ تھے یاس کو سب رجسٹراری کی خدمت پر مامور کردیا اور مرہٹواڑہ میں ایسے مقام پر متعین کر دیا جہاں پر کافی آمدنی ہوتی تھی۔ لیکن اس اللہ کے بندہ نے کبھی دست غیب کو نہ خود ہاتھ لگایا نہ دوسروں کو اجازت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دفتر کے عمال اُن کے شاکی ہو گئے۔ وہاں سے اُن کا تبادلہ لاتور کر دیا گیا۔ لاتور میں اُنہوں نے اپنا منتشر کلام جمع کیا اور لاہور سے شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ سے شائع کرایا۔

پنشن کے بعد یاس حیدر آباد آئے۔ میرے بزرگ محترم غلام پنجتن صاحب اُس زمانہ میں نظامت فوجداری بلدہ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز تھے اور حیدرگوڑہ میں فروکش تھے۔ پنجتن صاحب کے بے حد اصرار پر یگانہ صاحب اُن کے یہاں بحیثیت مہمان کے فروکش ہوئے لیکن اِس شرط پر کہ نہ تو وہ پنجتن صاحب کی دعوتوں میں شریک ہوں گے اور نہ اُن کے دوستوں اور عزیزوں کی فرمائش پر اپنا کلام سُنائیں گے۔ وہ اُن ہو حق کی صحبتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔

پنجتن صاحب یگانہ کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے لیکن مزاج سے بہت گھبراتے تھے۔ یگانہ بڑے خود دار تھے۔ بڑے حسّاس اور تنک مزاج تھے۔ بیکسؔ اکبر آبادی نے یگانہ کے متعلق ایک قصہ بیان کیا ہے جس سے اُن کی نازک مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "جے پور کے مشاعرے میں حیدر آباد سے مرزا یگانہ چنگیزی آئے تھے۔ یہ مشاعرہ ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا۔ میرے اُن کے مخلصانہ مراسم کا فانی صاحب کو علم تھا۔ فرمانے لگے۔ مرزا یگانہ مجھ سے ایک غلط فہمی کی بنا پر خفا ہو گئے ہیں۔ چلو اُن سے صلح کرا دو۔ ہم یادگار میموریل میں یگانہ صاحب کا کمرہ تلاش کرتے ہوئے پہونچے۔ فانی صاحب کے علاوہ تمام شعرا یہیں مقیم تھے مرزا صاحب نہایت شائستہ آدمی تھے۔ وہ بڑے تپاک اور خلوص سے پیش آئے مگر صرف مجھ سے۔ اپنی کرسی چھوڑ کر پلنگ پر بیٹھ گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھایا۔ فانی صاحب کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ نہ اُن سے بیٹھنے کو کہا۔ میں اِن کے اِس طرز سے بے کیف ہو کر معذرت کر کے فانی صاحب کو ساتھ لے کر اُٹھ آیا۔ اس روز

شب کو مشاعرہ کی آخری محفل تھی۔ اور اساتذہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ یگانہ صاحب کو کچھ تو اِس مجلس میں جگر صاحب نے برافروختہ کر دیا تھا اور پھر وہ اِس لئے ناخوش ہو گئے کہ اُن کا نام فانی سے پہلے پکار لیا گیا وہ ڈائس پر تشریف لے گئے اور محفل کو مخاطب کر کے فرمایا "غزل تو میں نے پوری ہی لکھی ہے۔ مگر جس نمبر پر مجھے آواز دی گئی ہے اس نمبر پر چار ہی شعر پڑھوں گا" پھر انھوں نے واقعی چار ہی شعر پڑھے ورنہ عموماً شاعر چار شعر پڑھنے کا اعلان کر کے چودہ شعر پڑھتے ہیں۔

یگانہ نے اپنی تنک مزاجی اور افتادِ طبیعت کی وجہ سے بڑی صعوبتیں اُٹھائیں لیکن خود داری کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا اور کبھی کسی سے مدد کے طالب نہیں ہوئے۔ خود فرماتے ہیں۔

نگاہِ یاس کا عالم جو آگے تھا سو اب بھی ہے

ہزاروں گُل کھلے بازیچۂ شام و سحر ہو کر

سبحان اللہ! کیا کہنا اِس استقامت اور پامردی کا۔ باوجود ہنگامو

اور مخالفتوں کے پائے ثبات نہ ڈگمگایا۔ پھر ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

زمانے بھر کا منھ تکتے ہیں کیوں، اپنی طرف دیکھیں
بسر کرنا ہے جن کو رنگ و بوئے رائیگاں ہوکر

معاشی بدحالی کا بعض وقت یہ عالم ہوتا تھا کہ یاس کے پاس پہننے کو کرتہ تک نہیں رہتا تھا لیکن وہ یہ نہیں معلوم ہونے دیتے تھے کہ شیروانی کے نیچے کرتہ ہے بھی یا نہیں۔

یگانہ کے متعلق ایک دلچسپ قصّہ

لکھنؤ سے کچھ دور ایک قصبہ سندیلہ ہے جہاں کے لڈّو مشہور ہیں اور جو پہلے تہذیب و تمدن کا مرکز رہ چکا ہے۔ یہاں ایک مسلمان بزرگ واسطی تھے جو فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اُن کے بیٹے منشی التفات رسول تھے۔ سندیلہ اور گردو نواح میں یہ منشی جی کہلاتے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد صاحبِ خاندان نواب اعجاز رسول منشی جی کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ لیگ اور

کانگریس میں ایک ممتاز حیثیت رکھ چکے ہیں۔ اُن کی شادی پنجاب کے ایک امیر وکبیر کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اُن کی بیوی اعجاز رسول کو کون نہیں جانتا۔

عُرس واسطی کے سلسلے میں سندیلہ میں ایک عظیم الشان طرحی مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ یہ مُشاعرہ آل انڈیا معیار کا تھا اور اُس میں تمام ہندستان کے خاص کر لکھنو کے ممتاز شعرا شریک ہوتے تھے۔ ایک سال کا ذکر ہے کہ اس مشاعرہ میں جناب یگانہ کو بھی مدعو کیا گیا۔ پھر کیا تھا لکھنو کے شاعروں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب کہنے لگے کہ ہم اس مشاعرہ میں شریک نہیں ہوں گے۔ مشاعرہ کے منتظمین میں شوق سندیلوی بھی تھے جن کی کتاب اصلاحِ سخن شعر نواز طبقہ میں رُو شناس خاص وعام ہو چکی ہے۔ اُنہوں نے میرے ایک دوست کو یہ قصہ سنایا کہ اُنہیں لکھنو جاکر وہاں کے شاعروں کی بڑی خوشامد کرنی پڑی جب وہ مشاعرہ میں آنے کو تیار ہوئے۔

جگہ ہونا۔ اثر ہونا۔ طرح تھی۔ جناب یگانہ اُن دنوں یاس تخلص کرتے تھے اور لکھنو کے مدرسہ میں فارسی پڑھاتے تھے مصرعہ

طرح پر تقریباً سنو شعر لکھے لیکن مشاعرہ میں پڑھنے کے لئے صرف سات آٹھ شعر منتخب کئے۔ چھپی ہوئی غزل لے کر مشاعرہ میں گئے۔ اُن کے پڑھنے کا انداز بھی نرالا تھا۔ ہندستان کے ہر شاعر کی دُھن اُڑائی جا سکتی تھی مگر یگانہ کے انداز میں غزل نہیں پڑھی جا سکتی تھی۔

مشاعرہ میں جناب یگانہ نے اپنے مخصوص انداز میں غزل پڑھی۔ ایک سماں بندھ گیا۔ لکھنو کے شعرا منھ تکتے رہ گئے۔ غزل کا مقطعہ تھا۔

سُنا کرتے تھے، اب آنکھوں سے دیکھیں، دیکھنے والے
نگاہِ یاس کا سنگیں دلوں پر کارگر ہونا

ایک اور مشاعرہ کا حال سنئے:۔

۱۹۲۶ء میں الہ آباد میں پنڈت رادھے ناتھ کول گلشن کے طرحی مشاعرے کے موقع پر جس کی صدارت سر تیج بہادر سپرو نے کی تھی۔ یاس نے جو غزل پڑھی وہ مشاعرے ہی سے ضرب المثل ہو کر مشہور ہو گئی۔ غزل کا مطلع ملاحظہ فرمائیے۔

قفس میں بوئے بستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر، نویدِ ناگہاں پہنچی ہے مرگِ منتظر ہو کر

یاسؔ جب مشاعرے میں پڑھتے تھے تو سارے مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ یاسؔ کے اشعار کو یکسوی اور اطمینان کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ان پر تھم تھم کر غور کیا جائے اور ان کی تہہ در تہہ معنویت کو سمجھا جائے۔ یاسؔ کے بہت کم اشعار ہیں ایسے ملتے ہیں جن میں زندگی کی نئی آگاہیاں نہ ملتی ہوں اور جن سے ہمارے اندر تازہ توانائی اور زندگی نہ پیدا ہوتی ہو۔ یاسؔ کے اشعار بغیر تفکر کے اچھی طرح نہیں سمجھے جا سکتے۔

یہ پوری غزل برسوں اہلِ ذوق کی زبانوں پر تھی۔ یاسؔ کی اس غزل کا ہر شعر جدتِ فکر اور ندرتِ اسلوب کی اپنی آپ مثال ہے۔ ایک اور شعر سنئے۔

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کے دل دھڑکتے ہیں
مبادا رنگ و بو اُڑ جائے پامالِ خزاں ہو کر

یاسؔ نے کس خوب صورتی سے ثابت کیا ہے کہ عشق، حسن کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے۔ عشق معصوم اور بے ضرر نہیں۔ اس سے زیادہ حسین پیرایہ تصور میں نہیں آسکتا۔ ایک اور مطلع ملاحظہ ہو

ٹھوکریں کھلوائیں کیا کیا پائے بے زنجیر نے

گردشِ تقدیر نے جولانیٔ تدبیر نے

انسان صرف تقدیر کا بندہ نہیں بلکہ جملہ حادثات و واردات کی تشکیل میں خود انسان کے ارادہ اور تدبیر کو بھی بڑی حد تک دخل ہے۔

کتنی خوش اسلوبی اور دل نشینی کے ساتھ ہم کو یہ راز سمجھایا گیا ہے کہ "گردشِ تقدیر" "جولانیٔ تدبیر" دو متضاد طاقتیں نہیں ہیں۔

یاسؔ پرگو شاعر نہیں تھے۔ وہ اُس وقت تک شعر نہیں کہتے تھے جب تک کوئی شدید تاثر یا کوئی نیا یا واضح تصور اِن کے اندر شعر کہنے کی تحریک نہ پیدا کرے۔ یاسؔ کے کلام کا انتخاب کرنا ذرا مشکل کام ہے۔ اِس لئے کہ اِن کے وہاں بھرتی کے اشعار بہت کم ملتے ہیں۔ یاسؔ کے ہر شعر میں ایک انفرادی سطوت کا احساس پایا جاتا ہے۔

یاسؔ کی طبیعت میں خودداری اور بے نیازی ضرورت

سے زیادہ تھی۔ شاید یہ کسی نفسیاتی گرہ یا اندرونی تصادم کا نتیجہ ہے۔ یاسؔ اپنے کلام کی اشاعت کی طرف سے ضرورت سے زیادہ بے نیاز تھے۔ بقول مجنوں گورکھپوری۔

"یاسؔ کا پہلا مجموعہ کلام "نشترِ یاس" کی اشاعت کے بعد یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی آواز اپنے دور میں اپنے عنوان کی ایک آواز ہے اور لوگ اس آواز کو سننا اور اس کے ارتعاشات کو اپنی آوازوں میں جذب کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ مشاعروں میں تو اول اول کشاں کشاں پہنچ بھی جاتے تھے یا پہنچا دیئے جاتے تھے۔ یاسؔ کی شاعری نوجوانوں کو ایک نئی طرز کا احساس و فکر اور ایک نیا عنوانِ اظہار دے سکتی تھی۔ ان کے پندار اور تبختر کی وجہ سے نہ صرف ان کی شاعری کی حق تلفی ہوئی بلکہ اردو شاعری کی نئی نسل ان سے جو کچھ حاصل کر سکتی تھی اس میں ناقابلِ تلافی خسارہ ہوا۔"

یگانہ کو نہ روپیہ کمانے کی ہوس تھی اور نہ روپیہ جمع کرنے

کا لالچ۔ وہ اپنا پورا وقت مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ نہ وہ کسی سے مذاق کرتے تھے اور نہ مذاق برداشت کر سکتے تھے۔

پنجتن صاحب جب بنجارہ ہل پر رہنے کے لئے آگئے تو یگانہ نے اُن کے ساتھ آنا پسند نہیں کیا اور نامپلی اسٹیشن کے مہمان خانے میں ایک چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔ چند سال کے بعد وہ لکھنو چلے گئے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

لکھنو کے دورانِ قیام میں یگانہ نے بہت اذیتیں اُٹھائیں۔ کاش وہ حیدرآباد سے نہ جاتے۔ لکھنو کی فضا یگانہ کے لئے کبھی سازگار ثابت نہیں ہوئی۔ یگانہ کی بیوی ترکِ وطن کر کے پاکستان جا چکی تھیں۔ وہ نخاس میں اپنے ایک قریبی عزیز کے ساتھ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں مقیم تھے معروف ادیب و نقاد مسعود حسین رضوی صاحب نے خود مجھ سے فرمایا کہ یگانہ کو سخت تکلیف تھی۔ اور وہ اِس جسمانی اور روحانی ایذا کا ذکر مولوی مسعود حسن رضوی صاحب سے بار بار کیا کرتے تھے اور التجائیں کرتے تھے کہ کچھ نہ کچھ بندوبست کرو اور اِس جہنم سے نجات دو۔ مسعود حسن رضوی صاحب کا گھر لق و

ودق ہے لیکن بقول اُن کے یگانہ کے رہنے کے لئے ایک علٰحدہ حصّہ دیا جانا ممکن نہیں تھا۔ آخر مسعود صاحب نے یگانہ سے کہا کہ بھئی مجھے شرم آتی ہے۔ مکان کا جو حصّہ تمہیں دیا جاسکتا ہے وہ تمہارے شایانِ شان نہیں۔ مالی کے رہنے کی کوٹھری خالی کرائی جاسکتی ہے۔ یگانہ نے اِسی کو غنیمت سمجھا۔ کم از کم صاف ہوا میں سانس لینے کا موقع تو ملے گا۔ وہ مسعود حسن رضوی صاحب کے گھر کے بیرونی حصّہ میں مالی کی کوٹھری میں اُٹھ آئے۔ تھوڑے دن کے بعد یگانہ مسعود حسن رضوی صاحب کے گھر سے منتقل ہو گئے۔ یگانہ سے سو ادبی ضرور سرزد ہوئی۔ اور اُنہوں نے چند ایسی رباعیاں لکھیں جو اُنہیں نہیں لکھنی چاہیئے تھیں اور جن سے مسلمانوں کا مذہبی جذبہ اور وجدان بُری طرح سے متاثر اور بڑی حد تک مجروح ہوا۔ اس کی پاداش میں ایک بڑا افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ لکھنو کے چند سماج دشمن عناصر نے اُن سے بدلہ لینے کی خاطر قانون اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اُنہیں ایک گدھے پر اُلٹا سوار کرایا۔ اُن کا منہ کالا کیا گیا۔ راستہ بھر اور محلہ محلہ

ڈھول اور تاشہ بجاتے ہوئے اور پان کی پیک اُن کے اوپر تھوکتے ہوئے گشت کرایا گیا۔ یہانتک کہ جب گدھا تھک کر گر جاتا تھا تو ڈنڈے مار مار کر اُٹھایا جاتا تھا۔ گالی گلوج کے علاوہ اُن پر کنکریاں بھی پھینک کر ماری گئیں۔

تعجب ہے کہ اِس روشن زمانہ میں، بیسویں صدی میں، انفرادی آزادی کے دَور میں، دور دراز ریگستانوں میں نہیں، آفریقہ کے جنگلوں میں نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کے گہوارہ ہندستان میں۔ اُتر پردیش کی راج دھانی لکھنؤ میں، رات کے اندھیرے میں نہیں۔ دن کی روشنی میں، جواہر لال نہرو کے ہندستان کے ایک شہری کی یہ دُرگت بنائی گئی اور حکومت اور پولیس اُس وقت تک خاموش تماشائی بنی رہی جب تک قانون شکن عوام نے اپنی اسکیم کو پورا نہیں کر لیا۔ اور غصّہ کی آگ کو انتقام کے چھینٹوں سے بجھا نہیں لیا۔ ذرا غور تو فرمایئے کہ نخاس سے یہ قافلہ محلہ محلہ کی گشت کرتا ہوا جب حضرت گنج پہنچا اُس وقت پولیس نے مداخلت کی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی پولیس اُس وقت تک کیا کر رہی تھی۔

مقدمہ چلا۔ پولیس نے مچلکے لئے۔ لیکن یہ تمام کارروائی

پھُس پھُسی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس کو گواہ نہ مل سکے۔ یہ تو ایک

نے نہیں ہزاروں نے تسلیم کیا کہ یگانہ کو حقیر و ذلیل کرنے کے لیئے

جو کچھ بیان کیا جاتا ہے سب کچھ حقیقتاً کیا گیا لیکن کس نے کیا

اور کون ذمہ دار ہے۔ نہیں معلوم ہو سکا۔ مقدمہ بغیر کسی کو سزا

دیئے ہوئے خارج ہو گیا۔ اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے

کہ یگانہ بہک گئے تھے اُنہوں نے گستاخی اور بے ادبی کی۔ اور مسلمانوں

کے مذہبی جذبہ کو مجروح کیا اور مستحق سزا تھے لیکن سوال یہ پیدا

ہوتا ہے کہ کس قسم کی سزا کے۔ اِس میں مطلق شک نہیں کہ

جس قسم کی اہانت انگیز سزا اُن کو دی گئی وہ نہ صرف غیر قانونی

بلکہ اخلاق سوز تھی۔ وہ ملک اور قوم کے دامن پر ایک بدنما

دھبہ ہے۔

علمی اعتبار سے بھی یعنی جرمیات اور سزائیات کے نقطہ

نظر سے بھی کسی کو کسی صورت میں شرمناک سزائیں دینے کا حق

نہیں اور منظم سماج بھی اِس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ خطا کار دل

کے خلاف کارروائی کرنے کا حق مخالف گروہ کے خانگی افراد یا جماعتوں کو دیا جاسکے' لہٰذا مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں کہ جو بھی یگانہ کا قصور تھا اُس سے بدرجہا بدتر اور بہت زیادہ افسوسناک اُن لوگوں کا رویہ رہا جنہوں نے اُن کے خلاف ہنگامہ برپا کیا اور کروایا۔

یگانہ من کے موجی تھے۔ دل چاہتا تھا تو اپنا کلام سناتے تھے ورنہ صاف انکار کر دیتے تھے۔ اور ایک دفعہ نہیں کہنے کے بعد ہاں کہلا لینا ناممکن تھا۔ خود داری کا عالم یہ تھا کہ چاہے مصائب کے پہاڑ ٹوٹ جائیں کبھی کسی کے سامنے اپنی معاشی بدحالی کا دکھڑا نہیں روتے تھے۔ اکثر ہنس کر کہا کرتے تھے کہ فانی کی طرح دربار داری اور جگر کی طرح کلام کے بیچنے کا گُر نہ مجھے آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔ اِسی واسطے مشاعروں میں روپیہ لے کر میر مشاعرہ بننے یا ریڈیو پر کچھ معاوضہ حاصل کر کے اپنے کلام کی تشہیر کرنے سے ہچکچاتے تھے۔

آل احمد سرور کے مندرجہ ذیل خیالات ایسا معلوم ہوتا

کے خلاف کارروائی کرنے کا حق مخالف گروہ کے نمائندگی افراد

یا جماعتوں کو دیا جاسکے، لہٰذا مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں

کہ جو بھی یگانہ کا قصور تھا اُس سے بدرجہا بدتر اور بہت زیادہ

افسوسناک اُن لوگوں کا رویہ رہا جنہوں نے اُن کے خلاف ہنگامہ

برپا کیا اور کروایا۔

یگانہ من کے موجی تھے۔ دل چاہتا تھا تو اپنا کلام سناتے

تھے ورنہ صاف انکار کر دیتے تھے۔ اور ایک دفعہ نہیں کہنے کے

بعد ہاں کہلا لینا ناممکن تھا۔ خودداری کا عالم یہ تھا کہ چاہے

مصائب کے پہاڑ ٹوٹ جائیں کبھی کسی کے سامنے اپنی معاشی

بدحالی کا دکھڑا نہیں روتے تھے۔ اکثر ہنس کر کہا کرتے تھے کہ فانی

کی طرح دربارداری اور جگر کی طرح کلام کے بیچنے کا گُر نہ مجھے آیا ہے

اور نہ آسکتا ہے۔ اسی واسطے مشاعروں میں روپیہ لے کر میر مشاعرہ

بننے یا ریڈیو پر کچھ معاوضہ حاصل کر کے اپنے کلام کی تشہیر کرنے

سے ہچکچاتے تھے۔

آل احمد سرور کے مندرجہ ذیل خیالات ایسا معلوم ہوتا

ہے کہ یگانہ بول رہے ہیں"۔ کیا شاعری کا مقصد صرف یہ ہے

کہ روزمرّہ زندگی کے چکّر سے اُکتائے ہوئے لوگوں کو تھوڑی سی تفریح،

تھوڑا سا نشہ، تھوڑے سے خواب عطا کر دیئے جائیں۔ کیا یہ دل بہلانے

کی چیز ہے۔ کیا حُسن کی رعنائی، عشق کے گداز، فلک کے جور و ستم،

زندگی کی بے رحمی کا تذکرہ کر کے دلوں کا بخار نکالنا کافی ہے؟

کیا مشاعروں میں گا گا کر اور جھوم جھوم کر لفظوں کی دکان لگانا،

پُرانے خیالوں کی جگالی کرنا، چبائے ہوئے نوالوں کو اُگلنا، دل

کے زخموں کے گلستاں کھلانا، وقتی داد اور سستی شہرت، فضا

میں تھوڑی سی گونج پیدا کرنا اور نگاہوں میں ذرا دیر کے لئے

بسنا۔ یہی شاعری کی معراج ہے۔

زمانہ بدل گیا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں تغیر ہو گیا ہے۔

زندگی کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ عشق کے علاوہ اور بھی حقیقتیں ہیں۔

فطرت پر اقتدار بڑھ رہا ہے۔ چاند کی سیر افسانہ نہیں حقیقت

ہونے والی ہے۔ صدیوں کے کچلے ہوئے انسان کروٹیں لے

رہے ہیں۔ دوستی اور دشمنی کے آداب بدل رہے ہیں۔ ہم مشینی دور

میں قدم رکھ رہے ہیں۔ مگر جاگیردارانہ تصورات کو گلے سے لگائے ہوئے ہیں۔ اگر ہماری شاعری اِن مسائل سے عہدہ برآ نہیں ہوسکی تو اپنے فرض سے قاصر رہے گی۔"

شاعری خوابوں کے کانٹے پر تول کر انہیں پرکھتی ہے۔ وہ معنی خیز تجربات، گہری بصیرت، بلند تخیئل، سچے مشاہدہ سے کام لے کر انسانیت اور اُس کے ابدی حُسن کا احساس دلاتی ہے۔ وہ اپنے سماج کی ہر تبدیلی کا عکس بھی پیش کرتی ہے۔ اور اپنے خوابوں کی آنچ سے اِس کی برف کو پگھلاتی ہے۔ اِس کی زبان تخلیقی ہوتی ہے، فرسودہ نہیں ہوتی۔ اس کی تصویریں روشن ہوتی ہیں۔ پرچھائیاں نہیں ہوتیں۔ وہ وقتی نشہ نہیں گہرا سرور بخشتی ہے جو زندگی کے لئے ایک طاقت ہوتا ہے۔ وہ صرف اشاروں کی عادی نہیں ہوتی۔ اپنی بات کھول کر بھی بیان کر سکتی ہے۔ شاعری کا فرض یہ ہے کہ وہ ہماری تعمیری قوتوں کو استوار کرے۔ ہم میں جرأت اور ہمّت پیدا کرے۔ حسِ جمالیات کو اُبھارے۔ پاک و پاکیزہ خیالات پیدا کرے۔

بقول مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم۔ "شاعری دراصل مصوری ہے۔ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اِس قدر دشوار نہیں جس قدر غیر محسوسات اور غیر مادی اشیاء کا نقشہ اُتارنا۔ رنج، غم، جوش، محبت، غیض، بیقراری، بیتابی، حسرت، خوشی، محسوس اور مادّی چیزیں نہیں ہیں۔ آنکھ اُن کو دیکھ نہیں سکتی۔ البتہ دل پر اُن کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا۔ شاعر کو فطرت کا بڑا نکتہ داں ہونا چاہیئے۔ شاعر کو جزئیات کا خیال رکھنا چاہیئے۔"

یگانہ نے اردو شاعری کے معیار کو یقیناً بلند کیا۔ مرزا یگانہ کہتے ہیں کہ میں لوگوں کی واہ واہ کی پروا نہیں کرتا۔ سچّی عزت جڑ کی طرح اندر ہی اندر پھیلتی ہے اور جھوٹی عزت پھولوں کی طرح چار دن کی بہار دکھا کر خاک میں مل جاتی ہے۔

بقول عبدالقیوم خاں باقی۔ "شاعرانہ مشرب کی روح رواں دو چیزیں ہیں۔ ایک ایقان دوسرے اثر۔ ایک حسن کار ساری دنیا سے الگ اپنا ایک ایقان رکھتا ہے جیسے آپ اُس کے مذہب،

مشرب، اُس کی دُنیا، نقطہ نظر کسی لفظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

وہ ہر شئے کے متعلق اپنی ایک رائے رکھتا ہے۔ یہ رائے کسی خاص قانون، مذہب، تمدن، عمل، تہذیب یا علم کے تابع نہیں ہوتی بلکہ اپنی واردات کے تحت اور ساری زندگی کا نچوڑ ہوتی ہے۔ جب یہ پختہ ہو جاتی ہے تو دنیا کی کوئی قوت اُسے اپنے مقام سے ہٹا نہیں سکتی۔"

ہر بڑے شاعر نے روایات سے بغاوت کی۔ غزل گوئی اور معاملہ بندی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کی جتنی اُن کی کوشش کامیاب ہوئی اتنی ہی اُن کی بڑائی نظر آئی لیکن اِس دیوارِ زندان کا توڑنا کوئی معمولی بات نہیں۔ بڑے دل گردے اور صلاحیت کا کام ہے۔ عام طور پر شاعر اکثر و بیشتر اپنے ذاتی خیالات، رجحانات اور احساس سے در گذر کر کے مانگے تانگے کے تاثرات اور اغیار کے خیالات پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا دوسروں کی خاطر اپنے رنگ کی قربانی کرتے ہیں تاکہ اُنہیں مقبولیت عام حاصل ہو اور مخالفت کم کی جائے۔

جو شاعری مقبولیت عام یا خوفِ مخالفت کی بنیاد پر قائم کی جائے وہ کبھی حقیقی نہیں ہوتی۔ نظم یا نثر عام فہم تو ضرور ہونی چاہیئے اور زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو اُس سے فائدہ پہونچنا چاہیئے لیکن قبول عام اور عام فہم ہونے میں فرق ہے۔ عوام کے معیار کو بلند کرنا، اُن کے ذوق کی تربیت کرنا ادیب اور شاعر کا پہلا فرض ہے۔"

بقول عالم خوندمیری "جمالیاتی قدریں دوسری تمام قدروں کی طرح بدلتے ہوئے سماجی حالات کی پیداوار ہوتی ہیں تنقید کا کام یہ نہیں کہ ایک اونچی سطح پر بیٹھ کر تخلیق پر حکم صادر کرے۔ اور ایک مفتی کی طرح "خیر و شر" کے فیصلے سنائے۔ تنقید اور تخلیق حریف نہیں بلکہ ایک ہی منزل کے ہم سفر ہیں۔

ادب اور فن حقیقتاً انسان کے تجربات کے تخلیقی اور جذباتی اظہار کا نام ہے اور اسی لئے داخلیت ہر اچھّے ادب اور فن کا ایک لازمی عنصر ہے۔ ہمارا کوئی تجربہ خالصتہً داخلی یا خالصتہً خارجی نہیں ہوتا۔"

یگانہ ہنر کے دلدادہ تھے اور اردو شاعری کے سچے

پرستار۔ غالب کا انہوں نے مذاق اڑایا لیکن وہ تو ایک

حربہ تھا حصولِ مدعا کا، اور مدعا کیا تھا خود انہیں کی زبانی

سُنئے۔ غالب شکن میں خود یگانہ نے لکھا ہے کہ میں تو یہ

دیکھنا چاہتا ہوں کہ ہنر کو ہنر کی حیثیت سے جانچنے اور

قدر کرنے کی صلاحیت ملک میں کتنی ہے۔ آیا لوگ اپنے

ہی ہم خیال اور ہم مشرب و ہم مذہب کے ہنر کو دیکھ سکتے

ہیں یا غیروں کے بھی۔ تنقید میں تعصب کی عام وجہ بے جا

حمایت، غلط تحسین اور گمراہ کن واہ واہ ہے۔ تنقید کی

بنیاد عقل اور ایمان پر رکھنی چاہیئے۔ تنقید وہ کسوٹی ہے

جس پر کھرا اور کھوٹا پرکھا جاسکتا ہے۔ اچھائی اور برائی میں

تمیز کی جاسکتی ہے۔ تنقید کا کام فن کو سنوارنا اور فن کار کی رہنمائی

اور اصلاح کرنا ہے۔ تنقید کسی آرٹ کے متعلق صحیح قوت فیصلہ کا

نام ہے۔ تنقید ہی سے ادبی تخلیق کے حسن و قبح کی وضاحت ہوسکتی ہے

گوئٹے کہتا ہے کہ نقاد نے دنیوی معاملات اور تجربات سے

اپنے اندر جو تعصب پیدا کیا ہے وہ عموماً اُس کی تنقیدوں

میں اُجاگر رہتا ہے۔ تنقید شخصیت پرستی کے لئے زہرِ ہلاہل ہے۔

یگانہ نے دراصل غالب پرستوں کی کورانہ عقیدت کا مضحکہ اُڑایا

ہے۔ وہ اُس بُت کو توڑ دینا چاہتے تھے جو اندھی تقلید پر

مائل کردے۔ خوب و زشت کچھ نظر نہ آئے۔ برائیاں بھی اچھائیاں

نظر آئیں۔

شخصیت پرستی ہماری قوم کا شعار ہے اور یہ ایک نہایت

خطرناک اور نقصان دہ ذہنیت ہے۔ یگانہ ہوابندی کا یہ طلسم

جو غالب کے نافہم مداحوں نے باندھ رکھا تھا توڑنا چاہتے تھے۔

اِس کوشش میں یگانہ نے لکھنؤ میں گالیاں کھائیں مغلظات

سُنیں۔ مادی نقصان اُٹھایا۔ اور اودھ پنچ اخبار کی ملازمت چھوڑ دی

۔ یگانہ کو سب سے بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ بے روزگاری

کے ہاتھوں تنگ آکر اُن کو اپنا قیمتی کتب خانہ کوڑیوں کے مول

بیچ دینا پڑا، لیکن اس مردِ غازی نے اپنی اصول پرستی کی خاطر

ہولناک کشمکشِ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اُن کے ہنر پر

عیب کا رنگ چڑھایا گیا۔ اُن کی تصنیفوں کے ساتھ مخاصمانہ سلوک کیا گیا۔ اُن کے خلاف زور و شور کا پروپگنڈہ کیا گیا۔ ادب کی محفلوں سے اُن کا منظم بائیکاٹ کیا گیا۔ سوچ سمجھ کر جان بوجھ کر ایک اسکیم کے تحت اُن کو گرانے، ذلیل کرنے، نیچا دکھانے کے پروگرام نہ صرف بنائے گئے بلکہ اُن پر عمل کیا گیا لیکن ان جھنجھٹوں کے باوجود یگانہ نے فن کی، فن کی حیثیت سے خدمت کی اور آرٹ کے جانکاہ مراحل کو استقلال اور پامردی کے ساتھ طے کیا۔

جب یگانہ سے یہ شکایت کی جاتی تھی کہ انھوں نے غالب کا مذاق کیوں اُڑایا تو وہ مسکرا کر بسمل سندیلوی کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

یہ راز کی باتیں ہیں کوئی اسے کیا سمجھے
بُت سامنے رکھ لینا اور یادِ خدا کرنا

یاس کا نسب نامہ ۔ نام مرزا واجد حسین تخلص یاسؔ۔ والد محترم کا نام مرزا پیارے صاحب تھا۔ ان کے بزرگ مرزا مراد بیگ چغتائی اور مرزا حسن بیگ چغتائی ایران سے ہندستان آئے

اور سرکار دہلی کی فوج میں ملازم ہوئے۔ فوجی خدمات کے صلہ میں جاگیریں، پرگنہ حویلی عظیم آباد میں ملیں۔ نانا نواب مرزا علی حسن خاں صاحب عرف بڑے بابو صاحب شہر عظیم آباد کے ممتاز رئیسوں میں تھے۔ مادرِ گرامی کا نام عترت فاطمہ بیگم تھا۔ ننہالی بزرگوں کا سلسلہ لکھنو سے تھا۔

سنہ ولادت اور تعلیم ولادت آخر ۱۸۸۳ء محلہ مغل پورہ شہر عظیم آباد میں ہوئی۔ پانچ چھ برس کے سن میں مولانا محمد سعید صاحب کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ فارسی کی چند درسیات کے بعد عظیم آباد محمڈن اینگلو عربک اسکول سے ۱۹۰۳ء میں درجہ دوم میں انٹرنس کا امتحان کامیاب کیا۔ شروع سے نہایت ذہین طالب علم تھے۔ ہمیشہ ہر جماعت میں اول آتے تھے جس کے صلہ میں ہر سال اسکول سے وظیفہ ملتا تھا۔ انٹرنس کامیاب کرنے کے بعد ۱۹۰۴ء میں کلکتہ گئے اور مٹیا برج میں شہزادہ مرزا مقیم بہادر کے صاحبزادوں یعنی شہزادہ محمد یعقوب علی مرزا اور شہزادہ یوسف علی مرزا کی انگریزی تعلیم پر مقرر ہوئے لیکن آب و ہوا موافق نہ آئی اور وطن واپس آگئے

دہلی، اجمیر، الہ آباد، بنارس وغیرہ کی سیاحت کے بعد آخر لکھنو کو اپنا وطن بنایا۔

وضع قطع ۔ یگانہ عجیب وضع قطع کے آدمی تھے۔ گندمی رنگ، اوسط قد، لمبی لمبی مونچھیں، چال البیلی، ڈھیلے ڈھالے کپڑے، غرارہ دار پائجامہ، کالی بالوں دار ایرانی ٹوپی، عینک لگی ہوئی، لکڑی ہاتھ میں، جھومتے جھامتے پیدل پھرتے تھے۔ بعض وقت بے ساختہ قہقہہ لگاتے تھے لیکن یہ قہقہے معلوم نہیں مصنوعی ہوتے تھے یا حقیقی۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کا دل روتا ہے لیکن وہ چار آدمیوں میں ہنستا بولتا ہے۔ سطحی ذہنیت رکھنے والے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کو کوئی غم نہیں لیکن حقیقت میں اندوہ وملال اُس کے دل کے گوشوں میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ یگانہ کو غمِ یار نے ستایا تھا یا نہیں۔ اُن کا دل تیرِ نظر سے گھائل ہوا تھا یا نہیں، ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ غمِ روزگار نے دربدر کی ٹھوکریں کھلائیں۔ وطن سے بے وطن کیا اور کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ خود فرماتے ہیں۔

اندھیرے اُجالے کہیں تو ملیں گے۔ وطن سے ہمیں دربدر کرنے والے

یاسؔ سنہ ۱۹۰۶ء میں لکھنؤ آئے تھے لیکن تھوڑے دنوں بعد

ملازمت کے سلسلہ میں پھر عظیم آباد جانا پڑا۔ عظیم آباد کی آب و ہوا راس

نہ آئی۔ مجبوراً لکھنؤ واپس آنا پڑا۔ سخت بیماری کے بعد جب صحت یاب

ہوئے تو نخاس کے قریب جناب آغائی صاحب کے بیٹے حکیم

مرزا محمد شفیع صاحب کی پہلی بیوی کی چھوٹی صاحبزادی محترمہ

کنیز حسین صاحبہ سے سنہ ۱۹۱۳ء میں شادی کر لی۔

یوں تو عظیم آباد میں ہمیشہ شعر و سخن کا مذاق اعلیٰ درجہ

کا رہا چنانچہ اس خاک سے ایک سے ایک قابل اُستاد پیدا

ہوئے۔ شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ یاسؔ ان علم و

ادب کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے اور اُس پر طرہ جناب خان

بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شادؔ کی شاگردی۔ یاسؔ کو مولانا

شادؔ کی شاگردی کا ہمیشہ فخر رہا۔

مستقل سکونت کے لئے جب لکھنؤ آئے تو سب سے پہلے

مولوی بندہ کاظم صاحب جاویدؔ سے راہ و رسم پیدا ہوئی اور اُس

کے بعد رشید، عارف، اوج، فصاحت، انجم اور افضل وغیرہ سے

نیاز حاصل ہوا۔

اُس زمانہ میں ایک جماعت "معیار پارٹی" نے لکھنؤ میں بڑا

زور باندھ رکھا تھا۔ اِس جماعت کے ارکان صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ،

محشرؔ تھے۔ مشاعرہ بازی کا بازار گرم تھا۔ یاسؔ نے بھی مشاعروں

میں شرکت کرنی شروع کی۔ یاسؔ کے کلام میں ایک انوکھا پن تھا

لہٰذا بہت جلد یاسؔ کا کلام مشاعروں میں دادِ سخن لینے لگا۔ ادبی

محفلوں میں یاسؔ کا چرچا کیا جانے لگا۔ شاعروں کی دھڑا بندی

اور آپسی رقابت تو مشہور ہی ہے پھر حضرات لکھنؤ۔ یار لوگوں کو

شغل بے شغلی اور بیٹھے بٹھائے کا ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔

شاعروں میں آپس میں چوٹیں چلنے لگیں۔ ایک دوسرے پر اعتراضات

کئے جانے لگے۔ پھبتیاں کسی گئیں، آوازے اُڑائے گئے۔ یاسؔ

بھلا کسی سے کیا دبنے والے تھے۔ یہ خود اپنے آپ کو اُستاد سمجھتے

تھے۔ یاسؔ نے بھی دل کھول کر لکھنؤ کے شاعروں پر اعتراض کئے۔

اُنہوں نے یاسؔ کو زک دینے کے لئے جا و بیجا، زیبا اور نازیبا

طریقے اختیار کئے۔ یاس کو اتنا پریشان کیا گیا کہ وہ اپنی ملازمت
ترک کر کے لکھنؤ چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے۔ لکھنؤ کی یاد یاس کو ہمیشہ
ستاتی رہی۔ ایک مدت گزرنے کے بعد وہ حیدر آباد میں بسلسلہ ملازمت
آ گئے تھے لیکن اُن کا دل لکھنؤ میں تھا۔ کہتے ہیں :۔

اللہ ری تصور کی یہ رنگین نظری ‏ ‏ غربت میں بھی دل جلوں کی کھیتی ہے ہری
کروٹ کروٹ ہے لہلہاتی جنت ‏ ‏ جب تک ہے ہوائے لکھنؤ سر میں بھری

ایک دوسری رباعی ملاحظہ ہو جس میں لکھنؤ جانے اور وہاں رہنے کا
اشتیاق ظاہر کیا ہے :۔

اے پائے طلب، ہوا پہ سبقت لے چل
مجھے وادیٔ وحشت سے سلامت لے چل
وہ جانِ وفا، نہ جانے کس حال میں ہے
لے چل، مجھے لکھنؤ امانت لے چل

تیسری رباعی اسی مفہوم میں ملاحظہ فرمائیے۔

اے لکھنؤ! اے دیارِ دُور افتادہ
اے جانِ من! اے بہارِ دور افتادہ

اب دور سے، اِس خاک کو سجدے کر لے
میں کون ہوں؟ اک مزارِ دور اُفتادہ

یاس من کے موجی تھے۔ دل چاہتا تھا تو اپنا کلام سناتے تھے ورنہ صاف انکار کر دیتے تھے اور ایک دفعہ نہیں کہنے کے بعد ہاں کہلا لینا ناممکن تھا۔ دولت اور اقتدار کے دباؤ میں آنا جانتے ہی نہ تھے۔ خودداری کا عالم یہ تھا کہ چاہے مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں کبھی کسی کے سامنے اپنی معاشی بدحالی کا دُکھڑا نہیں روتے تھے۔ اکثر ہنس کر کہا کرتے تھے کہ فانی کی طرح درباداری اور جگر کی طرح کلام کو بیچنے کا گُر نہ مجھے آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔ اِسی واسطے مشاعروں میں روپیہ لے کر میر مشاعرہ بننے یا ریڈیو پر معاوضہ حاصل کر کے کلام کی تشہیر کرنے سے ہچکچاتے تھے۔

یگانہ احساسِ برتری کے شکار تھے۔ دوسرے اُن کی نظروں میں بہت کم سماتے تھے۔ اُن کی اُفتادِ طبیعت خودداری اور بے نیازی۔ خمیر سے بنی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اوائل عمری کی کسی نفسیاتی گرہ یا الجھاؤ کا نتیجہ ہو۔ اِس لیے جا پندار

خودداری اور تبختر کا نتیجہ تھا کہ یاس کو جو شہرت حاصل ہونی چاہیئے تھی حاصل نہ ہو سکی۔ بیسویں صدی نشر و اشاعت اور تشہیر کی صدی ہے۔ جو ڈھنڈورا پیٹتا ہے آخر کار کامیاب ہوتا ہے۔ بار بار ذکر خبر آنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام و خاص جاننے لگتے ہیں۔ ریڈیو، سینما، اخبار، رسائل ان تمام ذریعوں کو اگر اختیار نہ کیا جائے تو عالم سے عالم اور قابل سے قابل آدمی گمنامی کے گوشہ میں پڑا رہے گا اور اگر تشہیر کے ان وسیلوں کو اختیار کیا جائے تو معقول قابلیت رکھنے والا آدمی بھی علامہ، فن کار، اہلِ نظر اور اہلِ بصیرت مشہور ہو جائیگا۔

یگانہ کی ایک ناقابلِ معافی خامی اور کمزوری یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ "انا" کے شکار تھے۔ وہ اپنے فن کا خود ہی ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔ خود اپنی ڈفلی بجاتے تھے۔ اپنے منھ سے میاں مٹھو بنتے تھے، لیکن تعلّی اور ڈینگ کی لینا تو باکمال شعرا کا شیوہ رہا ہے۔ امجد نجمی کا کہنا ہے کہ عربی میں ایک مثل ہے کہ شاعر کے لئے جو بات جائز ہے وہ دوسروں کے

لئے ناجائز ہے۔ مشرقی ادبیات میں شاعرانہ تعلّیاں شاید اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہمارے ادیب اور شاعر شاید اسی لئے اپنے فکر و فن اور کمالاتِ سخن کا اظہار بڑے فخر و مباہات سے کرتے آئے ہیں۔ اِس کے ذریعہ سے وہ اپنے کلام کا لوہا منوانا چاہتے تھے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے جو دبایا نہیں جا سکتا۔ دبانے سے یہ جذبہ اور اُبھرنے لگتا ہے۔ بمصداق ؎

رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور۔

ٹیگور کا قول ہے کہ فن کا بنیادی مقصد ہے "شخصیت کا اظہار" ۔ برتری کی خواہش انسان میں فطری طور پر پائی جاتی ہے۔ انسانی فطرت میں 'میرا' یا 'میں' بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اُس کی قدر کی جائے۔ سر آنکھوں پر بٹھایا جائے۔ آنکھیں فرشِ راہ ہوں۔ اُس کے اوصاف کا چرچا گھر گھر ہو۔ ہر آدمی قدر دانی کا خواہاں ہوتا ہے۔ اہلِ فن کی جب خاطر خواہ قدر نہیں ہوتی تو وہ بددل ہو کر زمانے کی شکایت کرتا ہے ملاحظہ ہو انیس کہتے ہیں :۔

ناقدریِ عالم کی شکایت نہیں مولا

کچھ دفترِ باطل کی حقیقت نہیں مولا

باہم گُل و بُلبل میں محبت نہیں مولا

میں کیا ہوں، کسی روح کو راحت نہیں مولا

عالم سے ہے مکدّر کوئی دل صاف نہیں ہے

اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

علامہ نیاز فتح پوری کا کہنا ہے کہ "آرٹ بڑی خودسر، بڑی سرکش، بڑی خود پرست چیز ہے اور وہی آرٹسٹ بہترین آرٹسٹ ہو سکتا ہے جس میں سب سے زیادہ انانیت ہو"

مولانا ابو الکلام آزاد کہتے ہیں کہ "سچا آرٹسٹ "میں" کا سرجوش کسی طرح نہیں دبا سکتا۔ اُن کی "میں" سرتاسر حقیقتِ حال کی ایک بے اختیارانہ چیخ ہوتی ہے۔" فخر و ادعا کمال کا خاصہ ہے۔ بڑھی ہوئی انفرادیت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی حد سے زیادہ خوددار ہو جاتا ہے اور وہ ساری دنیا کو ہوش سے بیگانہ سمجھنے لگتا ہے۔

بڑے شاعروں میں 'انا' کی مثالیں۔

میر:۔ دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر
دُر سے ہزار چند ہے' اِن کے سخن کی آب

سارے عالم پر ہوں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

مرزا رفیع سودا:۔

نہ پڑھیو' یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے
وہ اِن طرزوں سے کیا واقف' وہ یہ انداز کیا سمجھے

انشا:۔

اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے
کیا منھ ہے' ارسطو جو کرے' چوں مرے آگے

مصحفی:۔

خُوشہ ثُریا ہیں مرے خرمن کے یہاں ہیں
کیا شعر پڑھے گا کوئی موزوں مرے آگے

دبیر:۔

خاموش دبیر اب کہ نہیں طاقتِ گفتار

ہر مصرعہ برجستہ ہے سلکِ دُرِ شہوار

انیس :۔ لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
کسی نے تیری طرح سے اے انیسؔ عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

مومن :۔ یہ شاعروں کا میرے آگے رنگ ہے
جوں پیشِ آفتاب ہو بے نور چراغ

ذوق :۔ قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
ہر فن میں ہوں میں طاق، مجھے کیا نہیں آتا

غالب :۔ ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

داغ :۔ اے داغ کب چھپائے سے چھپتا ہے آفتاب
شہرہ کہاں نہیں ہے تمہارا کدھر نہیں

امیر مینائی :۔ میں شعر پڑھ کے بزم سے کیا اُٹھ گیا امیر
بلبل چہک کے صحنِ چمن سے نکل گیا

علامہ اقبال :۔ اُٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گُل نے

چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری
یگانہ :۔ آئینہ حق ہوں، خودپسندی کیسی
دیوانہ ہوں اپنا، ہوشمندی کیسی
عالم میں جدھر دیکھئے، میں ہی میں ہوں
بلند پستی کسے کہتے ہیں، بلندی کیسی

(۲) وہ دَور رہا، نہ وہ زمانہ باقی
ہے اور کوئی دن، یہ فسانہ باقی
کیا ادبار اور کہاں کا اقبال
دنیا فانی مگر یگانہ باقی

(۳) یارانِ چمن یہ رنگ و بو مجھ سے ہے
تم سے کیا ہوگا لکھنؤ مجھ سے ہے
میں جانِ سخن ہوں بلکہ ایمانِ سخن
دنیائے ادب کی آبرو مجھ سے ہے

(۴) گذری ہے بہارِ عمر تنکے چنتے
آتشکدۂ شوق میں جلتے بجھتے

یارانِ چمن گاتے ہیں اپنی اپنی

میری سنتے تو دیر تک سر دھنتے

خودداری اور خود بینائی سے متعلق یاس کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے

کیا بتاؤں کیا ہوں میں، قدرتِ خدا ہوں میں

میری خود پرستی بھی عینِ حق پرستی ہے

خضرِ منزل اپنا ہوں، اپنی راہ چلتا ہوں

میرے حال پر دنیا، کیا سمجھ کر ہنستی ہے

سراپا راز ہوں میں، کیا بتاؤں کون ہوں کیا ہوں؟

سمجھتا ہوں، مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

زہے معراجِ انسانی کہ بندہ ہوں تو اپنا ہوں

چڑھایا خود پرستی نے، نگاہِ دوست و دشمن پر

بندۂ خود شناس ہے اپنے ہی بیرہن میں مست

بوئے خودی کو دخل کیا، پیشگۂ ایاز میں

ایک مرتبہ پنڈت برج نرائن چکبست نے ایک مشاعرہ کیا۔

آتش علیہ الرحمہ کا مصرعہ (گریباں پھاڑ کر چل بیٹھئے صحرا کے دامن میں)

مصرع طرح تھا۔ یاسؔ نے غزل پڑھی۔ اُس پر "معیار پارٹی" کے حضرات اور اُن کے ہوا خواہوں نے فرمائشی قہقہے لگائے۔ غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے اور تصفیہ فرمائیے کہ کیا واقعی طنز آمیز قہقہوں کے مستحق ہیں:-

نہیں معلوم کیا سحر تھا، اُس بت کی چتون میں
چلی جاتی ہیں ایک چشمکیں، شیخ و برہمن میں

کنکھیوں سے، جو ہم کو، بزم میں، تم دیکھ لیتے ہو
کھٹک جاتے ہیں، کانٹے کی طرح، ہم چشم دشمن میں

حجاب ناز بیجا، یاسؔ، جس دن بیچ میں آیا
اُسی دن سے لڑائی ٹھن گئی، شیخ و برہمن میں

اس کے بعد منّے آغا صاحب کے یہاں بنّے صاحب طاہرؔ کی طرف سے ایک مشاعرہ ہوا۔ غالبؔ کی زمین میں (منظر کھلا، دفتر کھلا) پر طبع آزمائی کی گئی۔ اس مشاعرہ کی غزل کے بھی چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔

واں نقاب اُٹھی کہ صبح حشر کا منظر کھلا

یا کسی کے حسنِ عالمتاب کا دفتر کھلا

رنگ بدلا پھر ہوا کا، میکشوں کے دن پھرے

پھر چلی بادِ صبا، پھر میکدہ کا در کھلا

حسرتِ پرواز میں پر تولتے ہیں یاں اسیر

وہ صبا مستانہ آئی، وہ چمن کا در کھلا

صحبتِ واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں

راز اپنی میکشی کا، کیا کہیں، کیونکر کھلا

ہاتھ الجھا ہے گریباں میں، تو گھبراؤ نہ یاس

بیڑیاں کیونکر کٹیں، زنداں کا در کیونکر کھلا

"معیار پارٹی" کے ارکان نے یہ وطیرہ بنا لیا تھا کہ وہ اعتراضات لایعنی سے دوسروں کو مشتغل کرتے تھے لہٰذا یاس نے بقولِ خود ان حضرات کی استعدادِ علمی کا انکشاف کرنے کے لئے اعتراضات کا منھ توڑ جواب تحریری طور پر دینا شروع کیا۔

یاس کا کہنا تھا کہ شانِ تغزل یہ ہے کہ اسرارِ حقیقت پردہ مجاز میں بیان کئے جائیں ورنہ غزل غزل باقی نہیں رہیگی

فلسفیانہ خیالات اور قوانینِ قدرت کے مسائل کو روکھے پھیکے
الفاظ میں نظم کر دینا شاعری نہیں ہے۔ ادق سے ادق مسائل
کو ایسے فصیح لفظوں میں ادا کیا جائے کہ سننے والوں کو سمجھنے
میں دِقّت نہ ہو، بلکہ نفسِ مطلب کے ذہن نشین ہو جانے کے علاوہ
طرزِ بیاں سے بھی خاص لطف حاصل ہو۔ کلام میں خاص بانکپن،
تیکھا انداز ہو، اور پاکیزہ محاورے استعمال کئے گئے ہوں۔ ملاحظہ
فرمایئے کیا پتے کی باتیں کتنی سیدھی سادی زبان میں کہی گئی ہیں

یہ کنارا چلا کہ ناؤ چلی — کہئے کیا بات دھیان میں آئی
وقت کی بات اور وقت کے ہاتھ — سہو کیا چیز ہے، خطا کیا ہے
نئی زمیں، نیا آسماں، نئی دنیا — عجیب شئے یہ طلسمِ خیال ہوتا ہے

ساقیا دل کی ہوس، مٹ نہ سکی پیری میں
پیاس بجھتی نہیں، ٹوٹے ہوئے پیمانے سے

کارگاہِ دنیا کی، نیستی بھی ہستی ہے
اک طرف اُجڑتی ہے، ایک سمت بستی ہے

بیگانہ وار ایک ہی رُخ سے نہ دیکھئے

دنیا کے، ہر مشاہدۂ ناگوار کو

صورت نہ بگڑے، جلوۂ بے معنیِ حباب

قطرہ اگر اسیرِ طلسم ہوا نہ ہو

موجِ ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو

دنیائے گرد و باد کی نشو و نما نہ ہو

یاس کی قادر الکلامی ملاحظہ کیجئے! سودا کا مشہور و معروف مطلع ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

سودا کا مطلع:۔ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما، آشیانے میں

مرزا یاس نے اس زمین میں غزل کہی ہے۔ جس کے مطلع کی داد زمانے نے اس طرح دی کہ وہ زبان زدِ خاص و عام ہو گئی۔

یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانے میں

یادش بخیر، بیٹھے تھے کل آشیانے میں

اسی زمین کے دوسرے شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

صیاد اِس اسیری پہ سو جاں سے میں فدا

دل بستگی قفس کی کہاں آشیانے میں

ہم ایسے بد نصیب کہ ابتک نہ مر گئے

آنکھوں کے آگے آگ لگی آشیانے میں

رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہے یہ، کوئی

ہونگے قفس میں کل، جو ہیں آج آشیانے میں

۱۹۱۴ء میں یاس کے کلام کا پہلا مجموعہ "نشتر یاس" شائع ہوا۔ اِس پر اساتذۂ لکھنو یعنی حضرت اوج، عارف، رشید وغیرہ نے پر زور تقریظیں لکھیں۔ "معیار پارٹی" کے شعراء لکھنو انگاروں پہ لوٹ گئے۔ ۱۹۱۵ء میں مرزا یاس نے عروض و قوافی پر ایک رسالہ "چراغِ سخن" لکھ کر حریفوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔

یاس فطرتِ انسانی کے باریک سے باریک نکتوں کو نہایت آسان زبان اور دل آویز طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے شاعری

کا موضوع قرار دیا۔ وہ تقلید سے بیزار تھے۔ اُنہوں نے لکھنو اور دھلی کی غلامی سے آزاد ہو کر خود اپنی دماغی اُپج پر بھروسہ کیا

مرزا یاس کا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ بھلے آدمی کو صحیح معنی میں کوئی ذلیل نہیں کر سکتا۔ انسان ذلیل ہوتا ہے تو محض اپنے کرتوت سے۔ ذلیل وہ ہے جو ذلیل کام کرتا ہے۔ دوسروں کی گستاخیوں اور بیہودگیوں سے ذلیل نہیں ہو سکتا۔ جناب شفق لکھنوی کے مشاعرے میں جناب خفی لکھنوی کے برادرِ عزیز نے مرزا صاحب کی ہجو خود اُن کے سامنے پڑھی۔ حاضرین جن میں لکھنو کے مشاہیر شعرا اور رؤسا شامل تھے نہایت ٹھنڈے دل سے سنتے رہے۔ مرزا صاحب خاموش بیٹھے مغلظات سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ اِس تحمل کے لئے بڑا ظرف چاہیئے۔ ہم اشما تو چراغ پا ہو جاتے اور فوراً دھنگا مشتی پر اُتر آتے۔

مرزا یاس کے عقائد جبریہ فرقہ سے ملتے جلتے ہیں۔ وہ انسان کو فاعلِ مختار نہیں مانتے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ انسان مجبور ہے

مختار نہیں۔ اسی لئے قل آعوذیوں اور کٹھ ملاؤں نے اُن کے خلاف کفر کے فتوے عاید کئے۔ کلام میں اِس عقیدہ کی جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔

جبر و قدر کے مسئلہ پر کس خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔

عمر گھٹنے کے لئے ہے وقت کٹنے کے لئے

مفت دن گننے کو ہم پکڑے گئے بیگار میں

کہتے ہو اپنے فعل کا مختار ہے بشر

اپنی تو موت تک نہ ہوئی اختیار میں

بندۂ فطرت مجبور ہوں، مختار نہیں

ہاں ندامت میں ہے شک، جرم سے انکار نہیں

خاک کا پتلا ہے رفتارِ نمو سے مجبور

ہمہ تن سنگ بنے، یا ہمہ تن دل ہو جائے

اُن کا کہنا ہے کہ انسان اپنے نمو اور نشو ونما پر بھی قدرت نہیں رکھتا۔ وہ ارث اور ماحول کا تابع ہے۔

سمجھ میں آگیا جب' عذرِ فطرتِ مجبور

گنہگارِ ازل کو نیا بہانہ ملا

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے

وہ بدنصیب' جسے بختِ نارسا نہ ملا

شاعر نے نارسائی بخت کو معرفتِ الٰہی کا زینہ ثابت کر دیا۔

مجبوری اور ناکامی ہی کی وساطت سے۔

دے کچھ تو دادِ طبع ندامت شعار کو

کیا دیکھتا ہے لغزشِ بے اختیار کو

کجا صحنِ عالم کجا کنجِ مرقد بسر کر رہے ہیں بسر کرنے والے

انسان کو خدا پر یقین لانے کا موقع ملتا ہے۔ مولا مشکلکشا

کا ارشاد ہے۔ "میں نے اپنے خدا کو اپنے ارادوں کی پسپائی

سے پہچانا" وائے برحال اُن کے جنہوں نے کبھی نامرادیوں اور

ناکامیوں کا منہ نہ دیکھا ہو۔

یگانہ کا موضوعِ سخن فلسفۂ نفسیات و وجدانیات سے

متعلق ہے۔ اِس وجہ سے ہر زمانے اور ہر دَور میں زندہ رہنے

والی چیز ہے۔ اندازِ بیان میں انتہا کی کشش، ندرت اور پختہ

کاری ہے۔ کلام میں ایک زبردست انقلابی طاقت موجود ہے

مرزا صاحب کا احساسِ خودی و شیوۂ خودداری خارجی موثرات

کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اندرونی اور داخلی حیثیت رکھتا ہے۔

مرزا صاحب کا خیال یہ تھا کہ انسان کی پیدائش کی غایت

یہ ہے کہ وہ اپنے جذبۂ اُخوت و ہمدردی سے دنیا کے تمدن و

تہذیب کو خوشگوار بنائے اور عملی زندگی میں اصلاح اور اعتدال

پیدا کر کے تمدن کو ترقی دے۔

مرزا یاسؔ کو جدّتِ تصورات کے ساتھ ساتھ صحتِ مذاق

اعلیٰ پیمانہ کی عطا ہوئی تھی۔ اُن کے تصورات میں صوری و معنوی

حُسن موجود ہے۔ کلام میں درد اور جوش و خروش اِس قیامت

کا ہے کہ اردو شاعری میں آپ اپنی مثال ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

رہائی کا خیالِ خام ہے یا کان بجتے ہیں۔

اسیرو بیٹھے کیا ہو، گوش بر آوازِ در ہو کر

زمین کروٹ بدلتی ہے بلائے ناگہاں ہو کر
عجب کیا سر پر آئے پاؤں کی خاک آسماں ہو کر

نگاہِ یاس سے حاصل ہے سعیٔ لاحاصل
خدا کا ذکر تو کیا، بندۂ خدا نہ ملا

خدا بنے تھے یگانہ، مگر بنا نہ گیا ـــ
خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے   اِسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا
حیراں ہیں نظر والے بینا ہیں دل والے   کچھ رنگِ تماشا سے کچھ بوئے تمنا سے

مرزا صاحب کا کلام شروع سے آخر تک ORIGINAL ہے۔ کہیں واقعیت سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں :-

پسینا تک نہیں آتا تو ایسی خشک توبہ کیا   ندامت وہ کہ دشمن کو ترس آ جائے دشمن پر

یاس کا دل حقائق اور معارف کا گنجینہ تھا اور زبان رموز و اسرار کی ترجمان۔ ملاحظہ فرمائیے۔

بھاگتا ہے یار آغوشِ تصور سے بھی دور   کچھ ٹھکانا یاسؔ ہے اِس اندیشۂ باطل کا
دل کو جلا کے سرمۂ بینش بنائیے   آنکھوں سے معرفت کا اگر حق ادا نہ ہو

مجنوں گورکھپوری جیسے اہلِ نظر اور مستند ناقد ارشاد فرماتے ہیں کہ "یہ تاثر اور فکر کا انداز، الفاظ کی دست کاری، اور استعارہ و کنایہ اقلیدسی بندوبست بیک وقت اُردو شاعری کی اِس نسل میں جو پہلی جنگِ آزادی کے بعد وجود میں آئی کسی کے ہاں شاید ہی ملیگا۔ غالب اور اقبال کے بعد یہ عرفان اِس حوصلہ مندی اور بلند ہمّتی کے ساتھ یاس کے سوا کسی دوسرے اُردو شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ یاس زندگی کی نامرادیوں کا ماتم کرنے والے شاعر نہیں ہیں۔ وہ ولولہ اور ہمّت کے شاعر ہیں۔ زندگی کا کس بَل جو یاس کی شاعری میں ہے وہ دورِ جدید کے کسی دوسرے غزل گو شاعر کے کلام میں نہیں۔ یاس کی آواز بعض اعتبارات سے ایک بالکل نئے عنوان کی آواز ہے جو وسعت، بلندی، اندرونی کیفیت اور علوئے ہمت میں اپنا خاص درجہ رکھتی ہے" علوئے ہمّت کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

منزلِ کی دھن میں آبلہ پا چل کھڑے ہوئے ... شورِ جرس سے دل نہ رہا اختیار میں

میں قفس میں بھی کسی روز نہ خاموش رہا ... کشمکش میں بھی طبیعت کا وہی جوش رہا

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائیگا ... مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا

لبِ دریا سے غرض ہے نہ تہہ دریا سے موج و گرداب سے ہے دست و گریباں ہونا

وحشیو! کیوں تنگ دل ہو، فصل گُل آنے تو دو

غنچہ غنچہ میں بہارِ صد گریباں دیکھنا

کیوں یاسؔ یونہی دُور سے مُنہ تکتے رہو گے

بے مانگے تو اِس بزم میں ساغر نہیں ملتا

مجنوں گورکھپوری کا کہنا ہے کہ یاسؔ کا کلام واقعی اُردو شاعری کی

آبرو ہی نہیں اِس کا ناموس ہے۔ یاسؔ نے غزل میں تازہ خیالی کے

عناصر شامل کئے۔ یاسؔ کی غزلیں مواد اور ہیئت دونوں کے اعتبار

سے عام روایت سے ہٹی ہوئی ہیں۔ یاسؔ انفعالی رومانیت یا کراہتی

ہوئی جذبانیت کے شاعر نہیں ہیں۔ وہاں آہ و بکا، نالہ و فریاد شاذ

و نادر ہی ہے۔ وہ شعورِ حیات کے شاعر ہیں اور اُن کے اشعار

باوجود مخالفت کے زندہ رہنے کی تاب رکھتے ہیں۔ یاسؔ اُردو

غزل میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ بقولِ علیم اللہ "صبح نو، ۱۹۶۲ء" اگر یگانہ

چنگیزی غالب شکنی کو مدعا نہ بناتے تو شاید یہ گوہر اتنا ناپائدار

ہوتا جس کی ضو فشانی کے آگے بہت کم چراغ جل سکتے۔"

یگانہ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اردو شاعری کو روایت اور تقلید کی لعنتوں سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور ہندستان جیسے ملک میں یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں کیونکہ ہم روایت کے بندے اور رسم و رواج کے غلام ہیں اور کوئی بات ایسی نہیں کرنی چاہتے جسکو اسلاف نہ کرتے آئے ہوں۔ ذرا نئی روش اختیار کی اور لعن طعن کے تیر برسنے لگے۔ قدامت پرستی ہمارا شعار ہے۔ دقیانوسیت کے ہم پابند ہیں۔ لکیر کے فقیر بنا رہنا ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ پھر تعجب کیا ہے کہ یگانہ کی نئی روش اور اسلوبِ بیان پر لوگ کیوں نہ بپھرتے؟ یاس کی آواز اُس زمانے کی رُومانی آواز سے مختلف تھی۔ وہ زندگی کے حالات، واردات، کیفیات اور ماہیتوں کا شاعر تھا اور خاص حکیمانہ اندازِ سخن اور اسلوبِ بیان کا مالک تھا۔ یاس کے اشعار میں ایک خاص للکار، جھنکار اور چیلنج کا لہجہ نمایاں ہے اور یہی یاس کی اپنی خصوصیت ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر پیش ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:-

پچھلا پہر ہے، کاتبِ اعمال ہوشیار
آمادۂ گناہ، کوئی جاگتا نہ ہو

داورِ حشر ہوشیار، دونوں میں امتیاز رکھ
بندۂ نا اُمید اور بندۂ بے نیاز میں

ناخدا کو نہیں اب تک نہ دریا کی خبر
ڈوب کر دیکھے تو یگانہ ساحل ہو چکے

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترکِ دعا کرتے ہیں

یگانہ کی ایک اہم خوبی اُن کی تلخ نوائی تھی۔ طنز، چوٹ اور تلخ نوائی کا بھی ادب میں ایک مقام ہوتا ہے۔ یگانہ طنز کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ یہ خوابِ خرگوش کے مزے لینے والے شانہ ہلانے سے چونکنے والے نہیں ان کو تو جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے۔ یگانہ کے چبھتے ہوئے جملوں، فقروں اور برمحل محاوروں نے اردو ادب کے ساکت و صامت سمندر میں ایک طوفان بپا کر دیا۔ کلام میں طنز کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے:

ترکِ لذّت دنیا کیجئے تو کس دل سے
ذوقِ پارسائی کیا، فیض تنگ دستی ہے

کیا قیامت کا طنز ہے کہ یہ محض تنگ دستی کا فیض ہے کہ لوگ پارسائی اختیار کرنے کا بہروپ بھرتے ہیں

زمانہ اس کے سوا اور کیا وفا کرتا
چمن اُجڑ گیا، کانٹے گلے کا ہار ہوئے

شیطان کا شیطان، فرشتہ کا فرشتہ
انسان کی یہ بوالعجبی، یاد رہے گی

مجھے اے ناصحا آخر کسی کو منھ دکھانا ہے

بہانہ کر کے تنہا پار اُتر جانا نہیں آتا

مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزماؤ گے

راس آئے تم کو جوہرِ شمشیر دیکھنا

دلِ بے حوصلہ ہے، ایک ٹھیس کا مہماں

وہ آنسو کیا پیئے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

ہنس کے کہتا ہے کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو

سبق الٹا مرا صیاد، پڑھاتا ہے مجھے

دیکھ لیتا ہوں چمن کو دور سے بیگانہ وار

پاس مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبانِ بہار

دردمندوں کی کہانی پر دلِ بے دسترس

ہاتھ ملکر فرض سے اپنے ادا ہو جائے گا!

بقول سید علیم اللہ "زبان کی خوبی اور کیفیات قلبی کا غیر مصنوعی بیان یگانہ کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت ہیں۔ زبان و اسلوب کی کہیں ناہمواری نظر نہیں آئے گی۔ محاوروں کا با موقع استعمال کلام کے حسن کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے محاوروں کے استعمال پر یگانہ کو کامل قدرت حاصل ہے۔" محاوروں کے استعمال کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

کیوں انقلابِ عشق یہ کیسی ہوا چلی جی سن سے ہو گیا رُخِ بیمار دیکھ کر

حاشئے کیا کیا چڑھاتے ہیں قفس میں زندہ دل
مُردہ دل، کہتے ہیں، بے معنیٰ ہے، فرمانِ بہار
چھوڑیئے دیر و حرم کو یاس، دلی دور ہے
اس دورا ہے میں، غضب کا سامنا ہو جائے گا
شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خون دل
غم کھاتے کھاتے منہ کا مزا تک بگڑ گیا
پالا امید و بیم سے ناگاہ پڑ گیا
دل کا بنا بنایا گھروندا بگڑ گیا
لفظ "ناگاہ" کا تصرف ملاحظہ فرمایئے بیٹھے اردو اس کو کہتے ہیں۔
اسیرِ شوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے
مگر چادر کے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا
لُٹ گیا سارا کاروانِ عدم
ایک کو ایک کی خبر نہ ہوئی
آنکھوں آنکھوں میں لے لیا وعدہ
کانوں کان، ایک کو خبر نہ ہوئی
یگانہ کا کمال یہ ہے کہ اُس نے غزل میں نئی نئی راہیں
نکالیں۔ جاگیردارانہ تخیلات اور تصورات سے اپنے کلام کے
دامن کو بچایا۔ چچوڑی ہوئی ہڈیوں کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں

دیکھا۔ وصل و ہجر کے فرسودہ مضامین سے جہاں تک ممکن ہوا گریز کیا۔ اُن کی غزلوں میں تفکر و تجسس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اُن کے عشقیہ اشعار میں بھی جلال و جمال کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

ٹھیٹھ تغزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:۔

سلسلہ چھڑ گیا جب، یاسؔ کے افسانے کا
شمع گُل ہو گئی، دل بجھ گیا، پروانہ کا

ناتوانی کا بُرا ہو، غش پہ غش آنے لگے
دو گھڑی دل کھول کر رونا بھی مشکل ہو گیا

دیکھو تو اپنے حسینوں کی جامہ زیبیاں
اللہ رے حُسن، پیرہنِ تار تار کا

تصویرِ نزع، دیکھنا چاہو تو دیکھ لو
رہ رہ کے جھلملانا چراغِ مزار کا

کسی کے ہو رہو، اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کے زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

دیوانہ بن کے اُن کے گلے سے لپٹ بھی جاؤ
کام اپنا کر لو، یاسؔ، بہانہ بہانہ میں

اللہ رے توڑ، نیچی نگاہوں کے تیر کا
اُف بھی نہ کرنے پائے تھے اور دل کے پار تھا

دُور سے آج اُن کو دیکھ لیا
دل کو تسکین ہوئی، مگر نہ ہوئی

ایسا رونا بھی کوئی رونا ہے
آستیں آنسوؤں سے تر نہ ہوئی

اُف رے چشمِ عتاب اُف رے جلال
برقِ سوزاں ہوئی، نظر نہ ہوئی

دیوانہ وار دوڑ کے کوئی لپٹ نہ جائے
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھا نہ کیجئے

تا حشر، ترکِ لذّت ایذا نہ کیجئے
یعنی گناہ عشق سے، توبہ نہ کیجئے

یاس کے کلام میں الفاظ کا ترنم اور دلکشی بلا کی ہے۔ بقول مجنوں گورکھپوری "یاس کے اشعار کو یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ان پر تھم تھم کر غور کیا جائے اور ان کی تہہ در تہہ معنویت کو سمجھا جائے۔ ان میں زندگی کی آگاہیاں ملتی ہیں اور زندگی مردانہ وار بسر کرنے کا حوصلہ پایا جاتا ہے۔"

یگانہ نے شاعری کو شکست و فرار اور ذہنی عیاشی کا وسیلہ بنانے کی بجائے حقیقت اور آرٹ اپنا منتہائے نظر قرار دیا۔ وہ ادب کی محض روایتی اور جامد قدروں کا قائل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قدامت پسند اور روایت پرست گروہ آتش

سے متنفر ہو گیا۔ اصل میں یہ رجعت پسند گروہ جدّت اور تخلیق کو گوارا ہی نہیں کر سکتا۔

یگانہ نے شاعری کو شکست و فرار اور ذہنی عیاشی کا وسیلہ بنانے کی بجائے حقیقت اور آرٹ کی ہم آہنگی کو اپنا منتہائے نظر قرار دیا۔ وہ شاعری کو حسن و عشق کی ذہنی تسکین کی بجائے فکر و عمل کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ بیداری اور تشکیل حیات کا ایک ذریعہ ــــــ وہ شاعری کو غمِ جاناں کے چکر سے نکال کر غمِ دوراں کا مقابلہ کرنے کا سلیقہ عطا کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی نظر میں زندگی اصل میں نہ یکسر قہقہہ ہے نہ تمام تر کراہ۔ زندگی بیک وقت قہقہہ اور کراہ کا ایسا امتزاج ہے جس کے توازن اور عدم توازن ہی میں ہیئت اجتماعی کے تعمیری اور تخریبی اسباب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یاس نے خالص نشاطیت اور فراریت کے تنگ حدود سے نکل کر زندگی کی حقیقت کو واضح کیا۔ اُس نے بے مثال محاوروں کے استعمال سے واضح کر دیا کہ وہ نہ صرف گذشتہ ادب کے ورثہ کا امانت دار ہے۔ بلکہ نئے ادب اور انوکھے خیالات کی تعمیر و تاسیس، اُردو کی صحیح، معیاری اور مستند زبان کی بنیاد پر قائم کرنے کی اہلیت اور صلاحیت رکھتا ہے۔ یاس نے فکر و فن کے نئے رنگ اور آہنگ سے اپنے مرقعِ سخن کو آراستہ کیا۔

اُن کے کلام میں فصاحت، اور سلاست کا ایک سمندر موجزن نظر آتا ہے۔ اُن کا ایک منفرد لہجہ ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ یگانہ زندگی کے تلخ تجربوں کی وجہ سے افسردہ دل ہو گئے تھے اور اُن کی طبیعت ہر وقت مکدّر رہتی تھی لیکن بقول خود یگانہ کے تلخی و ترشی تزکیہ نفس کا آلہ بن کر انسان کو سچّی مسرتوں سے شاد کام کرتی ہے۔ مسرتیں بھی وہ جو نجاستوں سے پاک و صاف ہوں۔ میں کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہوا۔ ہاں زمانے کے سرد و گرم سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ یگانہ کہتے ہیں کہ "زندگی کا کوئی واحد معیار قائم نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی مدبرانہ اور عیارانہ زندگی کو کامیاب سمجھتا ہے۔ کوئی شاہانہ، جاگیردارانہ، زمیندارانہ، سرمایہ دارانہ، امیرانہ زندگی کو۔ کوئی مجاہدانہ اور فاتحانہ زندگی کو، کوئی راہبانہ زندگی کو، کوئی پیمبرانہ و مصلحانہ زندگی کو، اور کوئی شاعرانہ، ادیبانہ اور فلسفیانہ زندگی کو مایہ ناز سمجھتا ہے۔"

یگانہ وہ ہے جس نے اہلِ نظر کے دل و دماغ پر اپنے آرٹ کا سکّہ بٹھا دیا۔ حاسدانہ شورشوں کے ہجوم میں جس نے اپنا لوہا منوایا۔ یاس کا فلسفہ حیات یہ تھا کہ کسی حال میں بھی بد دل نہیں ہونا چاہیئے۔ حالات کتنے ہی خراب اور غیر مساعد کیوں نہ ہوں جی چھوٹا کرنا کم ظرفوں کا کام ہے۔ انسان وہی قابلِ احترام ہے جو ہمّت

نہ ہارے۔ اُتار چڑھاؤ اور حدوث و انقلاب تو فطرت کا مزاج ہے۔ اُن کے نزدیک حادثات، تغیرات اور موانع کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنا ہی جوانمردی ہے۔ کامیابی کا راز سعی پیہم اور ارادہ محکم میں ہے۔ اُن کے یہاں "صبر و تحمل کا تصوّر بھی مجہولی نہیں ہوتا بلکہ مجاہدانہ ہے۔" اِسی فلسفۂ حیات کا تصدق تھا کہ چاروں طرف کے یلغار اور مخالفت کے باوجود یگانہ چٹان کی طرح اپنے نظریہ پر اڑے رہے، اور حوادثِ زمانہ کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ معاشی جاں گسل حالات میں بھی ابرو پر بل نہیں پڑا، اور جو راستہ اختیار کیا تھا زندگی کی آخری سانس تک اُسی راہ پر گامزن رہے۔ یاس کی شاعری میں شکست و تکان کا دور دور پتہ نہیں چلتا بلکہ ہمّت، جرأت اور جوانمردی سے اُن کا کلام بھرا پڑا ہے۔ زبان و اسلوب کی کہیں ناہمواری نظر نہیں آتی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ایسے شعروں کا انتخاب بہت مشکل کام ہے جو سب کو پسند آئیں کیونکہ یہ اپنی اپنی پسند کا معاملہ ہے۔ ہر ایک نہ تو سِن و سال میں یکساں ہوتا ہے اور نہ یکساں مذاقِ سخن رکھتا ہے۔ اِس کے علاوہ بدلتے ہوئے حالات، کیفیات اور جذبات کے تحت اشعار کا تاثر بھی بدلتا رہتا ہے۔ بہرصورت میں اپنی پسند کے چند شعر آپ کے ملاحظہ میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ دو چار پسند آئیں۔

نہ ہارے۔ اُتار چڑھاؤ اور حدوث و انقلاب تو فطرت کا مزاج ہے۔ اُن کے نزدیک حادثات، تغیرات اور موانع کا سینہ سپر ہوکر مقابلہ کرنا ہی جوانمردی ہے۔ کامیابی کا راز سعی پیہم اور ارادۂ محکم میں ہے۔ اُن کے یہاں "صبر و تحمل کا تصور بھی مجہولی نہیں ہوتا بلکہ مجاہدانہ ہے۔" اِسی فلسفۂ حیات کا تصدق تھا کہ چاروں طرف کے یلغار اور مخالفت کے باوجود یگانہ چٹان کی طرح اپنے نظریہ پر اَڑے رہے، اور حوادثِ زمانہ کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ معاشی جاں گسل حالات میں بھی ابرو پر بل نہیں پڑا، اور جو راستہ اختیار کیا تھا زندگی کی آخری سانس تک اُسی راہ پر گامزن رہے۔ یاس کی شاعری میں شکست و تکان کا دور دور پتہ نہیں چلتا بلکہ ہمت، جرأت اور جوانمردی سے اُن کا کلام بھرا پڑا ہے۔ زبان و اسلوب کی کہیں ناہمواری نظر نہیں آتی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

ایسے شعروں کا انتخاب بہت مشکل کام ہے جو سب کو پسند آئیں کیونکہ یہ اپنی اپنی پسند کا معاملہ ہے۔ ہر ایک نہ تو سِن و سال میں یکساں ہوتا ہے اور نہ یکساں مذاقِ سخن رکھتا ہے۔ اِس کے علاوہ بدلتے ہوئے حالات، کیفیات اور جذبات کے تحت اشعار کا تاثر بھی بدلتا رہتا ہے۔ بہرصورت میں اپنی پسند کے چند شعر آپ کے ملاحظہ میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ دو چار پسند آئیں۔

منتخب اشعار

خار و گلُ دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے
دیکھیے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدانِ بہار

دلیلِ راہ، دلِ شب چراغ تھا اپنا
بلند و پست میں گذری ہے جستجو کرتے

سمجھتے کیا تھے، مگر سنتے تھے فسانہ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

آوازِ بازگشت ہے دیتے ہو کیا صدا
کس سے الجھ رہے ہو سوال و جواب میں!

حضرتِ دل ہیں عجب ظالم مظلوم نما
گھر جلا کر کفِ افسوس ملا کرتے ہیں

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے، تدبیر دیکھنا

منزل قدم سے لپٹی ہے، تقدیر دیکھنا

پہنا دیا ہے طوقِ غلامی، تو ایک دن

میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا

مردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت

ہاں! دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا

وحشیو! کیوں تنگ دل ہو، فصلِ گُل آنے تو دو

غنچہ غنچہ میں بہارِ صد گریباں دیکھنا

دل عجب جلوۂ موہوم دکھاتا ہے مجھے

شام سے یاس سویرا نظر آتا ہے مجھے

بڑھتے بڑھتے اپنی حد سے بڑھ چلا دستِ ہوس

گھٹتے گھٹتے، اک دن دستِ دعا ہو جائیگا

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر

ہوا ہنوز نہ گرداب کا، نہ ساحل کا

یاس کا کلام معرفت اور پند و نصائح سے بھی بھرا پڑا ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں

معرفت کی مثالیں۔

خدا معلوم کیا سحر تھا اُس بت کی چتون میں

چلی جاتی ہیں اب تک چشمکیں شیخ و برہمن میں

کھڑے ہیں دورا ہے پہ دیر و حرم کے
تری جستجو میں سفر کرنے والے
حسن وہ حسن کبھی جس کی حقیقت نہ کھلے
رنگ وہ رنگ، جو ہر رنگ میں شامل ہو جائے
ہمہ اوست کے فلسفہ کو کتنے سادے اور برجستہ الفاظ میں بیان
کر دیا ہے۔ اسی کو سہلِ ممتنع کہتے ہیں۔
پند و نصیحت :-
آنکھیں دکھاتے ہیں حباب، چشمِ ہوس کو بار بار
محوِ طلسم بندیٔ نقش و نگار دیکھ کر
دکھایا گورِ سکندر نے بڑھ کے آئینہ
جو سر اٹھا کے کوئی، زیرِ آسماں نکلا
کوثر بھی پہنچ کے آئے تو یہ نیت نہیں بھرتی
دریائے ہوس وہ ہے کہ ساحل نہیں رکھتا
چلیں کیوں دور کر ناداں جو ایسی ٹھوکریں کھائیں
بلند و پست عالم کو عبث بدنام کرتے ہیں
یادِ خدا کا وقت بھی آئے گا کوئی یا نہیں
یادِ گناہ کب تلک، شام و سحر نماز میں
محاوروں کی مثال :-

چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے

میں نہیں ہار ماننے والا

جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا

نکل چکا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا

چراغ لے کے ڈھونڈھتے ہیں دیوانے

نشاں تو دور رہے یاں نام تک نہیں دل کا

الٹی ہوا زمانہ میں چلتی ہے آجکل

فرق آگیا ہے گردشِ لیل و نہار میں

ٹھیٹھ غزل :-

صبر کہتا ہے کہ رفتہ رفتہ مٹ جائیگا داغ

دل یہ کہتا ہے کہ بجھنے کی یہ چنگاری نہیں

جہنم میں بھی جلنے کے لئے حاضر ہیں پروانے

کہیں اہلِ ہوس اندیشۂ انجام کرتے ہیں

دلِ وحشی بغیر اُن کے نہ بہلا ہے نہ بہلے گا

یہ کس دیوانہ کی خدمت وہ میرے نام کرتے ہیں

کعبہ نہیں کہ ساری خدائی کو دخل ہو

دل میں سوائے یار کسی کا گذر نہیں

افسردہ خاطروں کی خزاں کیا بہار کیا

کنجِ قفس میں مر رہے یا آشیانے میں

چتون سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا
چال سے تو کافر پہ سادگی برستی ہے

سلامت رہیں دل میں گھر کرنے والے
اس اُجڑے مکاں میں بسر کرنے والے

مزا گناہ کا جب تھا کہ باوضو کرتے
بُتوں کو سجدہ بھی کرتے تو قبلہ رو کرتے

بزم میں صبح ہوئی چھا گیا اک سناٹا
سلسلہ چھڑ گیا جب یاس کے افسانے کا

کچھ دل کی لگی اور بھڑک جاتی ہے ساقی
ملتا بھی ہے اک جام، تو بھر کر نہیں ملتا

چند منتخب اشعار :-

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا

اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کا دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

علم کیا، علم کی حقیقت کیا؟
جیسی جس کے گمان میں آئی

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا
پرایا جرم، اپنے نام لکھوانا نہیں آتا

دلِ عجب، جلوۂ موہوم دکھاتا ہے مجھے
شام سے یاس، سویرا نظر آتا ہے مجھے

قفس میں ہوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہو کر
نویدِ نا کہاں پہنچی ہے، مرگِ منتظر ہو کر

ہوتا ہے بند ایک در، کھلتے ہیں، صد ہزار در
اپنی طرف سے شک نہ کر، نیّتِ کارساز میں

داورِ حشر کچھ نہ پوچھ، عہدِ شباب کا مزا
شہدِ بہشت تھا مگر، دستِ بخیل کا دیا

خدا میں شک ہو تو ہو، موت میں نہیں کوئی شک
مشاہدے میں کہیں احتمال ہوتا ہے

کہاں پر نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت نے
پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہو کر

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا

پیام زیرِ آب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی، انگڑائی لی، رہا نہ گیا

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں، یہ زیبا ہے
وہ لغزشوں پہ مری، مسکرائے ہیں کیا کیا

ہر شام ہوئی صبح کو، اک خوابِ فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد کریں گے

تو کیا ہمیں گنہگار ہیں، حُسنِ یار نہیں
لگاوٹوں کا گناہوں میں کیا شمار نہیں!

جیسے جنّت کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کسقدر واعظِ مکّار ڈراتا ہے مجھے

خود پرستی کیجیئے یا حق پرستی کیجیئے
یاس، کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجیئے

مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی
مزاج اُس دلِ بے اختیار کا نہ ملا

پیدا ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی
دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

اُمیدوارِ رہائی، قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا

پاؤں پھیلاتے ہیں رہ رہ کے اسیرانِ ہوس
چاہتے ہیں قفسِ تنگ گلستاں ہو جائے

کیا کریں، اُڑ کے جا نہیں سکتے
وہ قفس ہے، وہ آشیانہ ہے

لوگ بالیں سے ہٹ کے روتے ہیں
جیسے بیمار کو خبر نہ ہوئی

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے کتنے، مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

کیا جانے، آج خواب میں، کیا دیکھا یاس نے
کیوں چونکتے ہی آپ سے بیگانہ ہوگیا

دلِ آگاہ نے جب راہ پہ لانا چاہا
عقلِ گمراہ نے، دیوانہ بنانا چاہا

ناگاہ، چرخِ ستم گار نے کروٹ بدلی
بختِ بیدار نے جب مجھ کو جگانا چاہا

جذبۂ شوق نے جب عشق کی صورت بدلی
پھر مٹائے نہ مٹا، لاکھ مٹانا چاہا

یہ دل بے مدعا، بے گانۂ امید و بیم
غرق ہو کر آپ اپنا ناخدا ہو جائیگا

آبلہ پا نکل گئے کانٹوں کو روندتے ہوئے
سوجھا پھر آنکھ سے نہ کچھ منزلِ یار دیکھ کر

دوڑی جاتی ہے گھٹا سوئے چمن بادہ کشو
پردۂ غیب سے ہونے لگی تدبیر بہار

پاؤں ٹوٹے ہیں، مگر آنکھ ہے منزل کی طرف
کان ابتک ہوس بانگِ درا کرتے ہیں

اُلٹی ہوا، زمانہ میں چلتی ہے آج کل
فرق آگیا ہے گردشِ لیل و نہار میں

لبِ دریا کا ہوا ہیں نہ تہہ دریا کا
ناخدا کون سے گھاٹ اب لئے جاتا ہے مجھے

خزاں کے دم سے مٹا، خوب وزشت کا جھگڑا
چلو یہ خوب ہوا، گل رہے نہ خار رہے

دل اپنا جلاتا ہوں کعبہ تو نہیں ڈھاتا
اور آگ لگاتے ہو کیوں تہمتِ بیجا سے

حلال بھی مرے حق میں حرام واویلا
نگہِ شوق سے کیا کیا گل و ثمر گذرے

گناہِ زندہ دلی کہئیے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لئے، اتنا، کہ پھر ہنسا نہ گیا

خدا کسی کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے
قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا

ہم ایسے بدنصیب کہ ابتک نہ مر گئے
آنکھوں کے سامنے آگ لگی آشیانے میں

خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آتے ہیں کیا کیا

ہنوز زندگیِ تلخ کا مزا نہ ملا
کمالِ صبر ملا، صبر آزما نہ ملا

بلند ہو تو کھلے، تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

غیرت سے رنگِ نامۂ اعمال اُڑ نہ جائے
کیفیت نگاہِ گنہگار دیکھ کر

بے دلوں کی ہستی کیا جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
خواب ہے نہ بیداری ہوش ہے نہ مستی ہے

بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بد نصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا

خوشا نصیب جسے عشقِ شور انگیز
بقدرِ ظرف ملا، ظرف سے سوا نہ ملا

جواب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جانکاہ کا مزا نہ ملا

دعا گدائے اثر ہے گدا پہ تکیہ نہ کر
کہ اعتبارِ اثر کیا، مِلا مِلا نہ مِلا

دلِ طوفاں شکن تنہا جو آگے تھا وہ اب بھی ہے
بہت طوفاں ٹھنڈے پڑ گئے، ٹکرا کے ساحل سے

کریگا پرورشِ نخلِ آرزو کب تک
وہ بد نصیب، جسے ذوقِ انتظار نہیں

روح پھونک دیتی ہے ایک جنبشِ لب کیا
دیکھئے، دکھلاتا ہے، وعدہ مذبذب کیا

پیامِ مرگ سے، کیا کم ہے، مژدۂ ناگاہ
اسیر چھٹتے ہی تلملائے ہیں کیا کیا

حسرتِ پرواز میں پر تولتے ہیں یاں اسیر
وہ صبا مستانہ آئی، وہ قفس کا در کھلا

صحبتِ واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں
راز اپنی میکشی کا، کیا کہیں کیونکر کھلا

ہاتھ الجھا اب گریباں میں، تو گھبراؤ نہ یاس
بیڑیاں کیونکر کٹیں، زنداں کا در کیونکر کھلا

پیالہ خالی اٹھا کر لگا لیا منہ سے
کہ یاس کچھ تو نکل جائے حوصلہ دل کا

چھوڑ کر جائیں کہاں، اب اپنے ویرانہ کو ہم
کونسی جا ہے جہاں، حکمِ خزاں جاری نہیں

دردِ دل صیاد کو کچھ کچھ سنانا چاہیئے
گھٹ کے مر جاؤں تو پھر لطفِ گرفتاری نہیں

گزرے ہوئے زمانے کی اب یاد کیا ضرور
چرچے قفس نصیبوں میں کیوں آشیاں کے ہیں

ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر
ہوا ہنوز نہ گرداب کا، نہ ساحل کا

زنجیر پھر ہلا دی نسیمِ بہار نے
پھر باہر آپ سے، ترا دیوانہ ہو گیا

خاک کا پتلا بگولا دشت کا ہو جائے گا
مٹ کے بھی اک پیکرِ نشو و نما ہو جائے گا

خامۂ قدرت کی ہے ہر صنعت اپنی مثال
امتیازِ خوب و زشت، آنکھوں کو مشکل ہو گیا

ذوق جبتک ہے، جبھی تک ہے بہارِ رنگ و بو
دل ہے جبتک دل، جبھی تک ہے کھٹک بھی خار میں

عمر بیداریِ موہوم کے دھوکہ میں کٹی
اب جو چونکے ہیں، تو آپ اپنا گلہ کرتے ہیں

اسیروں کی یہ خاموشی کسی دن گل کھلائے گی
قفس سے چھوٹ کر، سر پر اٹھالیں گے گلستاں کو

۹/۱
۲۰۵۵۵/ ① ۷۳۵

کوئی تصویرِ خزاں ہے کوئی تصویرِ بہار
دیدنی ہیں کارنامے خامۂ تقدیر کے

بہارِ زندگی ناداں، بہارِ جاوداں کیوں ہو
یہ دنیا ہے تو ہر کروٹ وہی آرامِ جاں کیوں ہو

دور سے آج اُن کو دیکھ لیا
دل کو تسکین ہوئی مگر نہ ہوئی

ہوں ریگ کے مانند شب و روز سفر میں
آوارۂ وحشت کوئی منزل نہیں رکھتا

تڑپ کے آبلہ پا اُٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا

مزے کے ساتھ ہوں اندوہ و غم تو کیا کہنا
یقیں نہ ہو تو کوئی کر لے امتحاں اپنا

عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانے کی بلند و پست کا ہموار ہو جانا

ہم ایسے بدنصیب گرفتارِ آشیاں
کیا جانیں، گرم و سرد، خزان و بہار کو

یہ کس نے گرم رفتارِ فنا کی راہ کھوٹی کی
بٹھا کر پردۂ فانوس میں شمعِ شبستاں کو

مزاجِ حسن بدلے، آسماں بدلے، زمیں بدلے
سزائے عشق کیا بدلے گی، ذوقِ ناپشیماں ہو کر
لپٹتی ہے بہت یادِ وطن، جب دامن دل سے
پلٹ کر، اک سلام شوق کر لیتا ہوں منزل سے
ٹھٹھک رہے حرم و دیر کے دور آ ہے پر
خلاف جا نہ سکے، شاہراہِ فطرت سے
گلا نہ کاٹ سکے اپنا، وائے ناکامی
پہاڑ کاٹتے ہیں روز و شب مصیبت کا
نگاہِ یاس سے ہے آئینۂ غمِ فردا
نظر کے سامنے سامان ہیں، قیامت کے
رات دن شوقِ رہائی میں کوئی سر پٹکے
کوئی زنجیر کی جھنکار سے دلوا نبے
سزائے عشق بقدرِ گناہ ناممکن
یہی بہت ہے، کہ برہم مزاجِ یار نہیں
تڑپ تڑپ کے اٹھاؤں گا زندگی کے مزے
خدا نہ کردہ مجھے زندگی پہ اختیار رہے

رباعیات

اب چند قطعات اور رباعیاں ملاحظہ ہوں۔
سرگشتگی کے عنوان سے ایک جگہ کہتے ہیں:۔
دل کے ہاتھوں، خراب رہتے ہی بنی   افتاد پڑی جیسی، سہتے ہی بنی

ہم تیری تلاش میں، کہیں کے نہ رہے
کعبہ کو بھی خیر باد کہتے ہی بنی
یگانہ بہت آزاد خیال ہیں۔ وہ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر زور دیتے ہیں مثلاً

کیا مفت کا بہتان خدا پر باندھا
کیا گردشِ تقدیر کا چرخہ ناندھا
فطرت کیا ساتھ دیتی نامردوں کا
جیتے مُردوں کو کون دیتا کاندھا

بخشش کیسے کہتے ہیں، عنایت کیسی
ملک اپنا ہے، مال اپنا، اجازت کیسی
قدرت کا خزانہ ہے تصرف کے لئے
تقدیر کے ٹکڑوں پہ قناعت کیسی

یگانہ عمل اور عمل کی برکتوں پر بہت زور دیتے ہیں۔

یگانہ کے پاس گوشِ نصیحت نیوش بھی ہے اور دیدۂ عبرت نگاہ بھی۔

یگانہ زندگی کی حقیقتوں کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور انہیں اپنی مخصوص ٹکسالی اردو میں بیان کرتے ہیں۔ وہ عمیق اور دقیق مسائل کو باتوں باتوں میں سمجھاتے ہیں۔ مثلاً

دیکھے ہیں بہت چمن اُجڑتے بستے
کیا کیا گلِ پیرہن لُٹے ہیں سستے
اے زندہ دِلانِ باغ اتنا نہ ہنسو
آنسو بھی نکل آتے ہیں ہنستے ہنستے

چارہ نہیں کوئی جلتے رہنے کے سوا
سانچے میں فنا کے ڈھلتے رہنے کے سوا
شمع تری حیات فانی کیا ہے
جھونکا کھانے سنبھلتے رہنے کے سوا

یگانہ کی رباعیوں میں رومانیت کا لطیف عنصر بھی ملتا ہے:۔

کیا جانے کوئی عید منانے کے مزے
جب تک نہ اُٹھائے دل لگانے کے مزے
اے عید منانے والو مجھ سے پوچھو
روٹھے ہوئے دوست کو منانے کے مزے

اور اس رباعی کا جواب تو اردو شاعری میں نہیں۔

وہ مست کہ بے پیئے چھلکتا جائے
نشہ میں شباب کے بہکتا جائے
آئینہ کا سامنا کرے گا کیونکر
اپنے سایہ سے جو بھڑکتا جائے

مذہب کے بارے میں یگانہ کہتے ہیں

ہے اور بھی اک راہ مذہب کے سوا
منطق کے سوا، علم مذبذب کے سوا
باز آ گئے منزل سے کہاں کی منزل
مطلب نہیں کوئی ترک مطلب کے سوا

یا معمۂ ہستی کے عنوان سے کہتے ہیں:-

کیوں مطلب ہستی و عدم کھل جاتا
کیوں رازِ طلسم کیف و کم کھل جاتا

کانوں نے جو سن لیا وہی کیا کم ہے
آنکھیں کھلتیں تو سب بھرم کھل جاتا

تھمنے کا نہیں قافلۂ موجِ سراب
کٹنے کا نہیں مرحلۂ موجِ سراب
آغاز ہی آغاز ہے انجام کجا
عالم ہے عجب سلسلۂ موجِ سراب

دنیا نے جسے اپنے شکنجے میں کسا
چھوٹا نہ کبھی موت کے پھندے سے میں پھنسا
پانی بھی نہیں مانگتا اِس کا مارا
سوتا ہے پڑا جیسے ناگن کا ڈسا

مخمورِ مئے شباب ہو لینا تھا
کم سے کم اک نیند سو لینا تھا
دامانِ ہوس کہیں بھگو لینا تھا
بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینا تھا

رونا ہے بَدا جنہیں وہ جم جم روئیں
جب عیش مہیا ہو تو ہم کیوں کھوئیں
فردا معلوم و رازِ فردا معلوم
رات اپنی ہے پھر کیوں نہ مزے سے سوئیں

کعبہ کی طرف دُور سے سجدہ کر لوں
یا دیر کا آخری نظارہ کر لوں
کچھ دیر کی مہماں ہے جاتی دُنیا
اک اور گنہ کر لوں کہ توبہ کر لوں

ڈرتے ڈرتے گناہ کر لیتا ہوں
دزدیدہ سہی، نگاہ کر لیتا ہوں
کیا کیجئے دادِ حُسن دیتے ہی بنی
دُکھتے ہوئے دل سے آہ کر لیتا ہوں

Scanned by CamScanner

پیری کی ہوس، ہزار منتر پڑھتی
گھٹنے کے سوا، عمرِ رواں کیا بڑھتی
جھونکے میں فنا کے کیا نپٹتا کوئی
مرجھائی ہوئی بیل منڈھے کیا چڑھتی؟

یارانِ شباب، رات کٹنے کی ہے دیر
بجھتا ہے کنول، ہوا پلٹنے کی ہے دیر
محفل میں جھومتے رہو گے، کب تک
آنکھیں کھلنے کی، دل اچٹنے کی ہے دیر

دنیائے دنی کا آسرا لینا کیا
باطل کے آگے سر جھکا لینا کیا
ناحق احسانِ ناخدا لینا کیا
بندے کے تئیں خدا بنا لینا کیا

جس باگ پہ چاہے موڑتی ہے دُنیا
کستی ہے کبھی جھنجھوڑتی ہے دُنیا
پائے ہمّت کو توڑتی ہے دُنیا
نامرد بنا کے چھوڑتی ہے دُنیا

ساجن کو سکھی منالو۔ پھر سو لینا
سوئی قسمت جگالو۔ پھر سو لینا
سوتا سنسار۔ سننے والا بیدار
اپنی بیتی سنالو۔ پھر سو لینا

بدلے گی ہزار رنگ، دنیا تو ہے
بہلاتے ہیں دل ہم بھی تماشا تو ہے
پر ذرہ ہر دم یوں ہی بدلتا جائے
دھوکا ہے تو ہونے دو دھوکا تو ہے

دنیا کے مزے میں ڈوب کر کیا ترتے
آنکھیں رکھتے تو کیوں گڑھے میں گرتے
لو دیکھ لو اب عیش پرستوں کی دسا
مُردے دیکھے نہ ہونگے چلتے پھرتے

واللہ یہ زندگی بھی ہے قابلِ دید
اِک طرفہ طلسم دید جس کی نہ شنید
منزل کی دھن میں جھومتا جاتا ہوں
پیچھے تو اجل ہے آگے آگے اُمید

مطلب نہیں کوئی ترکِ منزل کے سوا
مقصد نہیں کوئی ترکِ باطل کے سوا
کعبہ کا ہوا ہیں نہ صنم خانے کا
سر جھک نہ سکا کہیں درِ دل کے سوا

ہاں اے دلِ ایذا طلب آرام نہ لے
بد نام نہ ہو مُفت کا الزام نہ لے
ہاتھ آ نہ سکے پھول تو کانٹے ہی سہی
ناکام پلٹنے کا کبھی نام نہ لے

پیاری دنیا کے چاؤ دیکھے ہیں بہت
ٹیڑھے سیدھے بھاؤ دیکھے ہیں بہت
کیا پیرِ فلک تاؤ دکھاتا ہے مجھے
اِن آنکھوں نے تاؤ بھاؤ دیکھے ہیں بہت

مفلس کو مزا زیست کا چکھنے نہ دیا
اِس نقدِ شباب کو پرکھنے نہ دیا
دنیا سے لپٹتے تو لپٹتے کیوں کر
پیٹھے پہ کبھی ہاتھ تو رکھنے نہ دیا

شاہوں کو نگاہوں سے گرا کر مارا
شہزادوں کو در بدر پھرا کر مارا
دنیا سے لپٹنے والے بے موت مرے
ایک ایک کو کیا دِھرا دِھرا کر مارا

منزل کا پتا ہے نہ ٹھکانا معلوم
جب تک نہ ہو گم۔ راہ پہ آنا معلوم
کھو لیتا ہے انساں تو کچھ پاتا ہے
کھویا ہی نہیں تو نے تو پانا معلوم

کوئی تجھ کو پکارتا جاتا ہے
کوئی ہمّت ہی ہارتا جاتا ہے
کوئی تہہ کو سدھارتا جاتا ہے
دریا ہے کہ موجیں مارتا جاتا ہے

قطعہ

گرم ہے حُسن کا بازار خدا خیر کرے
مست ہیں کافر و دیندار خدا خیر کرے
آنکھ لڑنے لگی دیوانوں سی دیوانوں کی
چل نہ جائے کہیں تلوار خدا خیر کرے

حرفِ آخر

حضرات میں نے اپنی بساط بھر اس بات کی کوشش کی ہے کہ یاس عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی کا تعارف آپ حضرات سے کرادوں۔ یگانہ کے کلام کا انتخاب کرنا اُردو کے پروفیسروں، ناقدوں اور ریسریچ اسکالروں کا کام ہے۔ اُن کو چاہیئے کہ عوام کے استفادے کی خاطر گوہرِ بے بہا ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالیں اور یگانہ کو مسندِ شعر و شاعری پر وہ جگہ دیں جس کا وہ صحیح معنیٰ میں مستحق ہے

اگر اس کتاب کا مطالعہ اُردو داں حضرات کو یاس عظیم آبادی، یگانہ چنگیزی کے کلام کا مطالعہ کرنے کا محرک ہو سکے تو میں یہ سمجھونگا کہ میری سعی مشکور ہوئی۔

میرے خیال میں بے لاگ تبصرہ نوخیز نسل کی رہبری کے لئے ضروری ہے۔

خدا کرے یہ حقیر ادبی خدمت مذاقِ ادب کو لطیف اور ذوقِ سخن کے معیار کو بلند کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ اچھے اور بُرے کا فیصلہ مبصرین کی نگاہیں اور انصاف پسند طبائع بخوبی کر سکتی ہیں۔